
ظفر بی اے

قافلے آ اُتریں

ظفر بی اے

پبلشرز

مکتبہ شاہتاج فلیمنگ روڈ لاہور

قیمت دو روپے

دوآبہ پریس ۶۹ ریلوے روڈ لاہور میں چھپی:-

اُس پیکرِ خلوص کے نام

جو ادب، آرٹ اور فن
کی تمامتر صلاحیتیں رکھتا ہے
جو زندگی کا ایک ہونہار ترجمان ہے
اور جس کا نام

ایم ایس اعجاز ہے

جو صداقت کا اعجاز مشہور ہے

خلوص کا
ظفر بی اے

حرفِ اوّل

"واہگہ کے اُس پار" ایک ایسا سوال ہے جو ہر اس ذہن میں ابد تک اُبھرتا رہے گا جو "واہگہ کے اس پار" اپنے ننگ و ناموس اور مال و متاع کی بہارِ رفتہ کا نوحہ خواں ہے "واہگہ" کی اہمیّت قیامِ پاکستان سے نہیں بڑھی بلکہ "ریڈ کلف" اور "مونٹ بیٹن" کے خونیں فیصلہ اور پنجاب کی غیر منصفانہ تقسیم نے واہگہ کو ہمارے لیے اہم ترین سرحد بنا دیا ہے اور یہ سرحد اگرچہ سیاسی، اقتصادی اور تمدنی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہے مگر اس اعتبار سے بھی اس سرحد کی اہمیّت بہت بلند ہے کہ اس نے اَن ہونی باتوں کو جنم دیا ہے اس کا وجود دلوں کے درمیان ایک پُر ہیبت دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دونوں طرف حُسن و محبّت کی ہزاروں داستانیں ایک ایک کر کے دم توڑ رہی ہیں یہ ایک جبرِ ناروا ہے جو ریڈ کلف نے محض اپنی مصلحتوں کی تکمیل کے لئے انسانیت کے جذباتِ محبّت پر روا رکھا۔

ظفؔر صاحب ایک ہونہار ادیب کی حیثیت سے سامنے آ رہے ہیں اور ان کے یہ افسانے بالکل اسی ذہن کی تخلیق ہیں جو اپنی گمشدہ بہاروں کا ماتم منا رہا ہے۔

"واہگہ کے اس پار" میں ظفرؔ صاحب کے جتنے افسانے شامل ہیں اگرچہ میں نے

ان سب کو نہیں دیکھا. لیکن جو نظر سے گزرے ہیں. ان کے مطالعہ کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ ظفر صاحب میں ایک حساس ادیب کی تمامتر صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں ہر افسانہ کا پلاٹ نہایت سادہ اور غیر مبہم ہے اور غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ یہ افسانے' افسانے کم اور واقعات زیادہ ہیں. ظاہر ہے کہ واقعات میں افسانوں سے زیادہ لذت زیادہ چاشنی اور زیادہ کشش ہوتی ہے.

ظفر صاحب نے " واہگہ کے اُس پار" میں تمام لذت آسودگی کو ایک طرف رکھتے ہوئے نہایت خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ایک حقیقت نگار ادیب و فنکار کا خاصہ ہوتا ہے

میں نے ظفر صاحب کے افسانوں میں اصلاح و تعمیر کا عنصر غالب پایا ہے اور مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب جس مقصد کیلئے پیش کی گئی ہے وہ اس کی اشاعت سے ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچے گا.

آخر میں' اس نئے ادارہ کو مبارکباد کہنا ضروری سمجھتا ہوں جس نے ادب کی اس تاجرانہ منڈی (لاہور) میں اصلاحی اور تعمیری مقاصد کے پیش نظر ذہین اور نوجوان ادیبوں کے شہپارے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے. مجھے امید ہے کہ ملک کا ہر طبقہ اس ادارہ سے پورا پورا تعاون کریگا. اور اسکی کامیابی کیلئے ہر ممکن کوشش کریگا —" واہگہ کے اس پار" پہلی پیش کش ہے. اسکی کامیابی ہی اس ادارہ کی بنیادوں کو مضبوط بنا سکتی ہے!

الطاف پرواز مدیر ماہنامہ "سحر" لاہور

۱۵ر جون سنہ ۱۹۵۱ء

ترتیب

واہگہ کے اُس پار

عید کا دن تھا میرے دوست نے مجھے دو دفعہ جگایا۔ مگر میں سونا
چاہتا تھا، ہاں میں آنکھیں بند کر کے اپنی نمی کے متعلق سوچنا چاہتا تھا
جونہی میں آنکھیں بند کرتا۔ اس کی مسکراتی ہوئی صورت میری آنکھوں کے سامنے
آجاتی۔ میں اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا۔ مگر وہ روٹھ کر چند قدم
پیچھے ہٹ جاتی، تصورات کی دُنیا میں مَیں گھنٹوں نمی سے باتیں کرتا وہ مجھے
مسکرا مسکرا کر جواب دیتی۔ اور مَیں اسی بے خودی میں محو اس پر سوالوں کی
بوچھاڑ کرتا کہ وہ سہم کر چھپ جاتی، نمی کے والدین بھارت میں مقیم تھے ہندوستان
کے بٹوارے کے بعد وہ پاکستان چلے آئے۔ مگر وہ اپنی جائداد کو چھوڑنا نہیں
چاہتے تھے چنانچہ امن ہوتے ہی سارا خاندان واپس بھارت لوٹ گیا چونکہ
نمی کو پاکستان کے ایک سکول میں اچھی تنخواہ ملتی تھی اس لیے نمی نے جانے

سے انکار کر دیا۔ دوسرے بھارت کے نام سے اسے قدرتی نفرت تھی۔ نمی کا مکان اسی محلے میں تھا جس میں میں رہتا تھا۔ اس کے حسن کا چرچا میں بھی چند دوستوں سے سن چکا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں چھتوں پر کچھ اس انداز سے پڑ رہی تھیں کہ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ میں صبح صبح کسی خاص کام سے اپنے ایک دوست کے ہاں جا رہا تھا۔ اچانک اوپر والی چھت سے ایک کنگھی گری جو میرے سر میں اس زور سے لگی کہ میں چونک اٹھا۔ چھت پر سے مجھے ایک قہقہے کی آواز سنی۔ ہاں ایسا قہقہہ جس میں محبت انگڑائیاں لے رہی تھی۔ میں نے سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا :-

"کیوں جی یہ کہاں کی شرافت ہے؟"

نمی نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ "معاف کیجئے گا میں چھت پر بیٹھی بال سنوار رہی تھی اچانک کنگھی میرے ہاتھ سے گر گئی۔"

میں نے کنگھی اٹھا کر اوپر پھینکنے کی کوشش کی مگر مکان بہت اونچا تھا۔ میں ناکام رہا۔ میں نے سر اوپر اٹھا کر کہا۔ "کیا کنگھی لے کر اوپر آجاؤں؟" نمی نے شرماتے ہوئے کہا چلے آئیے۔ چنانچہ میں لپک کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے میرا دم پھول گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ جونہی آخری منزل پر پہنچا۔ تو سامنے والا دروازہ کھلا۔ جہاں ایک

حسین دوشیزہ کھڑی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بالوں کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں خدا جانے کیا کیا سوچ گیا۔ اس کے بال سورج کی روشنی میں کس قدر خوبصورت معلوم دے رہے تھے سورج کی کرنیں اس کی زلفوں سے ہاتھا پائی کرتی ہوئی گتھم گتھا معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی پلکیں اس قدر ترچھی تھیں کہ میں پہلی ہی نظر میں اس قدر گھائل ہو گیا کہ نیچے اترنا مشکل نظر آنے لگا۔

میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ اتنی بلندی پر کیوں رہتی ہیں" نمی نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا" اس لئے کہ یہاں چور اُچکے کم آتے ہیں" پھر ذرا سنبھل کر بولی۔

"آئیے اندر تشریف لے آئیے"

تشریف رکھئے' نمی نے نوکرانی کو چائے لانے کے لئے پکارا میں نے چائے پینے سے انکار کیا۔ مگر وہ کہنے لگی' یہاں آپ کونسے روز روز آتے ہیں' چائے پینی ہی پڑے گی" میں نے ڈرتے ڈرتے چائے کا پیالہ اٹھایا۔ سوچا کہ جلدی سے پی لوں۔ مگر چائے اس قدر گرم تھی کہ میں نے ایک گھونٹ پی کر پیالہ میز پر رکھ دیا۔ سر جو اوپر اٹھایا۔ تو میری نظریں پوری طرح نمی کے چہرے پر پڑیں آنکھیں چار ہوئیں۔ نمی نے ایک لٹ کو جو اُس کے رخسار کا بوسہ لینے کو آگے بڑھی ہوئی تھی پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا!

"کیسی چائے پسند آئی آپ کو"

جی ہاں، ایسی چائے ہماری قسمت میں کہاں ہماری قسمت میں تو ہوٹلوں کی چائے ہے۔ پسند آئے یا نہ آئے، ناچار پینا ہی پڑتی ہے ابھی میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک سوال پوچھ لیا۔

قمی۔ "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

جس کا جواب میں نے مختصر سا دیا۔ "میں بی اے میں پڑھتا ہوں"۔

یہ سوال پوچھ کر وہ تو خاموش ہو گئی۔ مگر اب میری باری آئی۔ میں نے کئی ایک سوال پوچھے جن میں سے ایک سوال مجھے اب تک یاد ہے وہ یہ تھا "کیا آپ اس مکان میں اکیلی رہتی ہیں؟" جس کا جواب اس نے شرما کر دیا تھا "جی نہیں" جنہیں اللہ کا سہارا ہو انہیں کس بات کا خطرہ"

اس مختصر سی ملاقات کے بعد میں نیچے اتر آیا۔ مگر بے قرار۔ مجھے ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے میں کچھ کھو چکا ہوں۔ . . . . . کبھی کبھی خوشی کی ایک لہر میرے دل میں اٹھتی۔ مگر اس کے فوراً بعد جب میں یہ سوچتا کہ اس کے ماں باپ بھارت میں ہیں۔ اور میں پاکستانی ہوں۔ تو میں فوراً اداس ہو جاتا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا

دوسرے دن میں جب سو کر اٹھا۔ تو میری طبیعت کسی کی تلاش میں تھی۔ سوچا چلو دیکھیں شاید آج پھر ملاقات ہو جائے میرا گمان

صحیح نکلا۔ میں نے دور سے نمی کو دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ جونہی میں اس کے گھر کے قریب پہنچا اس نے مسکرا کر ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ میں رُک گیا۔ وہ مکان سے نیچے اتری اور بغیر کچھ بولے چل پڑی میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

جونہی ہم محلے سے ذرا دُور نکل گئے تو سب سے پہلا سوال جو نمی نے مجھ سے پوچھا وہ یہ تھا:۔

نمی۔ "کہیئے رات کیسے گزری"

سوال کا جواب میں نے ذرا ہوشیاری سے دیا۔

میں۔ "جی ویسی ہی جیسی آپ کی"۔

نمی۔ "میں تو بے حد پریشان رہی"

میں۔ "تو بس آپ خود سمجھدار ہیں۔ میں کیا بتاؤں کہ۔۔۔۔۔

نمی۔ "کب ملاقات ہو گی؟

میں۔ "آج شام چھ بجے"۔ اتنے میں "بس" آگئی۔ نمی "بس" میں سوار ہو کر سکول کی طرف روانہ ہو گئی۔ اور میں پیدل کالج کی جانب چل پڑا۔ کالج پہنچا پروفیسر نے بی اے کے داخلے کی تاریخ بتائی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میرا اس دنیا میں اب کون تھا؟ تحصیل علم کا میرا ایک ہی ذریعہ تھا وہ یہ کہ میں ریلوے سٹیشن پر اپنی فرصت کے

اوقات میں اخبار، رسالے اور کتابیں بیچا کرتا تھا۔ اس لئے زندگی میرے لئے کسی خاص دلچسپی کا باعث نہ تھی۔ مگر پھر بھی جس حال میں تھا خوش تھا۔ دنیا میں سوائے والد کے مجھے کسی کا سہارا نہ تھا۔ مگر بٹوارے کے وقت ہم کانپور سے پاکستان آ رہے تھے۔ تو انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا ——— میں مہاجر تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں غربت سے ڈروں۔ مجھے آزادی کی خواہش تھی وہ مجھے مل گئی — میں وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اور اللہ کے نام پر جئے جا رہا تھا۔ جب مجھے داخلے کا خیال آتا۔ تو میں کانپ اُٹھتا۔ دل ہی دل میں کہتا ...... اگر داخلے کا بندوبست نہ ہوا تو سارے سال کی محنت رائیگاں جائے گی ...... جب میں شام کو نمی کے مکان پر پہنچا۔ تو مجھے دیکھ کر وہ فوراً بھانپ گئی کہ میں کسی بات کے لیے پریشان ہوں ......

نمی۔ "آپ بیس منٹ دیر سے آئے"۔

میں۔ "شاید میں نہ ہی آتا۔ مگر میں آپ سے وعدہ کر چکا تھا میں نے سوچا کہ میرے نہ آنے سے آپ کو سخت پریشانی ہوگی ....."

میں نے لاکھ کوشش کی کہ میری مجبوریاں نمی کا بارِ خاطر نہ ہوں، مگر جب اس نے اس درد بھرے الفاظ میں کہا "کہ آپ مجھے غیر کیوں سمجھتے ہیں؟" تو میں اپنی بے بسی کی داستان سنانے پر مجبور ہو

ہو گیا۔ میں تو اپنی رام کہانی سنا کر خاموش ہو گیا۔ مگر وہ اداس ہو گئی۔۔۔۔۔

جب میں نے یہ کہا "نمی! میرا اس دنیا میں کون ہے؟"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ کیوں ایسا کہتے ہیں"

پھر اس نے اپنے کانپتے ہوئے لبوں سے چند اور الفاظ کہے جنہوں نے

میری زندگی بدل دی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"وہ کہنے لگی"

"آپ میری زندگی کی تکمیل ہیں"۔

"آج سے میری حیات آپ کے احکام کی تعمیل میں بسر ہو گی۔۔۔۔

"جو کچھ میرا ہے وہ آپ کا ہے"

یہ کہہ کر نمی نے مجھے داخلے کے لئے روپے دیئے اور اپنی طلائی

انگوٹھی میری انگلی میں ڈال کر مجھے کہنے لگی۔

"میں وعدہ کرتی ہوں"۔ کہ میں زندگی میں تمہارے سوا کسی دوسرے

سے پیار نہ کروں گی"۔

"تم میرے ہو"

"یہ انگوٹھی میری اور تمہاری محبت کی نشانی ہے"

کالج کے بعد میں نمی کے گھر آتا۔ گھنٹوں محبت کی باتیں ہوتیں۔

محبت تیزی سے اپنے انجام کی طرف جا رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ایک دن جب ہم سیر کے لئے دونوں باہر جانے کو تھے۔ تو کسی نے دروازے پر دستک دی میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک اجنبی آدمی کھڑا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اجنبی نمی کا بڑا بھائی ہے۔ جو مستقل پرمٹ بنوا کر نمی کو بھارت لے جانے کے لئے آیا ہے۔ اس کے آنے کے بعد وہ مجھے صرف ایکبار ہی، دو گھنٹے تک عہد و پیمان ہوتے رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"وہ اس قدر روئی"

کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے چلے جانے کے بعد مجھے صرف اس کا ایک پوسٹ کارڈ ملا جس میں اس نے مجھے میرے امتحان میں پاس ہونے کی مبارکباد لکھی تھی۔ آخر میں لکھا تھا کہ ۲ جون کو میں واہگہ کی سرحد پر آپ سے ملنے آؤں گی؟ ۔ ۔ ۔ ۔

میں دل میں امیدوں کی دنیا بسائے واہگہ پہنچا

میری نمی آئی۔

مگر چار گھنٹے کی مختصر ملاقات کے بعد

"واپس چلی گئی"

وہ تار کے اس طرف کھڑی تھی۔ اور میں اِس طرف، دونوں محبوب نمی نے مجھے پرمٹ بنوا کر بھارت آنے کی دعوت دی۔ میں نے واپس آ کر پرمٹ

کے دفتر میں کئی ہفتے صرف کئے مگر ناکام رہا آخر محبت غالب آئی اور میں محبت کے طوفان کی رَو میں بہتا ہوا چوری سرحد پار جانے کے جنون میں چل پڑا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ مگر سپاہی بدستور سرحد پر گشت لگا رہے تھے۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں چھپا بیٹھا یہ تمام ماجرا دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کب داؤ لگے اور میں نکل جاؤں۔ چار بجے کے قریب سپاہیوں کی آنکھ بچا کر میں سامنے کے گنے کے کھیت میں جا چھپا۔ جو بھارت کی سرحد میں تھا۔ صبح سویرے جب میں کھیت سے نکل کر سامنے والے گاؤں کا رُخ کئے جا رہا تھا۔ تو مجھے سامنے سے آتا ہوا ایک سکھ سردار ملا جب اس نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ تو بے ساختہ میری زبان سے نمستے کی بجائے السلام علیکم نکل گیا۔۔۔۔۔ یہ سن کر سردار جی مجھ پہ جھپٹے۔ کہا کیوں بے بابو تو پاکستانی ہے" میں نے لاکھ منت سماجت کی۔ مگر ظالم نے ایک نہ مانی۔ مجھے پولیس کے حوالے کر ہی دیا۔۔۔ ان ظالموں کو کیا معلوم کہ میں نے کیوں ایسا کیا۔۔۔ انہیں میری محبوبہ یوں سے کیا۔۔۔۔۔ دو سکھ سپاہیوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ اور مجھے امرتسر جیل میں بند کر دیا گیا۔ تاریخ تو مجھے یاد نہیں۔ مگر اتنا یاد ہے کہ منگل کا دن تھا۔ اللہ اسے سلامت رکھے مجسٹریٹ بڑا نیک انسان تھا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیوں مسٹر"

تمہیں کونسی چیز بھارت کھینچ لائی۔

میں حیران تھا کہ کیا جواب دوں۔ اس نے اپنے سوال کو دہرایا اور مجھے نہایت نرم لہجے میں کہا۔

"تم پاکستانی ہو؟"

جواب دینے سے گھبراتے کیوں ہو؟ پاکستانی کا لفظ سن کر میری ہمت بندھ گئی اور میں نے نہایت جرأت سے کہا:

"جی ہاں"

مجسٹریٹ نے تیسری مرتبہ پھر یہ سوال کیا کہ تمہیں کونسی چیز بھارت کھینچ لائی تو میں نے سر اوپر اٹھا کر کہا

"محبت"

مجسٹریٹ نے مسکرا کر کہا کس کی۔ میں ڈرا کہ مجسٹریٹ ناراض نہ ہو جائے۔ مگر اس مرتبہ اس نے میرے ساتھ اور بھی ہمدردانہ رویہ اختیار کیا اور کہا اگر سچ کہو گے تو سزا میں تخفیف کر دی جائے گی۔

"میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا"

"ممی کی"

اس ممی کی جو میری ہے اور کسی غیر کی نہیں ہو سکتی۔ یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ

لگایا۔ اور پاس کھڑے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"ملزم عاشق مزاج ہے"

جب مجسٹریٹ نے یہ کہا۔ تو میں نے کہا:۔

"محبت نہ ہندوستانی ہے"

"نہ"

"پاکستانی"

"محبت واہگہ جیسی سرحدوں سے روکی نہیں جا سکتی"۔۔۔۔۔۔۔۔

مجسٹریٹ نے افسوسناک انداز میں کہا:۔

"میں مجبور ہوں"

"قانون محبت کے سامنے جھک نہیں سکتا"

اس لئے میں تمہیں پندرہ دن کی سزا کا حکم دیتا ہوں"۔

پھر آہستہ سے کہا:۔

"اسے لے جاؤ"

میں نے تمی کو لکھا وہ ملاقات کو آئی اس کا چھوٹا بھائی اس کے ساتھ تھا ملاقات ہوئی۔ مگر اس ملاقات نے میری تمام امیدوں پہ پانی پھیر دیا۔ میں جیل کی سلاخوں کے اندر تھا۔ اور وہ باہر۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جاتی دفعہ وہ مجھ سے ملنے کا وعدہ کر گئی۔ مگر نہ آئی۔

میری رہائی کا آخری دن تھا جب مجھے تمی کی چھٹی ملی، لکھا تھا

"پیارے غازی"

محبت کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ اس جہان میں نہیں تو اگلے جہان میں ملوں گی آپ پاکستان چلے جایئے۔ میرے ماں باپ میری شادی کرنا چاہتے ہیں تا کہ میں آپ سے پھر نہ مل سکوں۔ انھوں نے مجھ پر کڑی نگرانیاں لگا دی ہیں۔

"میں مجبور ہوں"

"میں آپ کی ہوں"

"ہمیشہ آپ کی رہوں گی"

اگر مجھے شادی کرنے پر مجبور کیا گیا

"تو میں زہر کھا لوں گی"

میں نے امی کو بہت سمجھایا کہ میں شادی پاکستان ہی میں کروں گی مگر میری کوئی نہیں سُنتا۔

"آپ کی تمی"

اسی روز مجھے پاکستان پہنچا دیا گیا۔ اس واقعہ کے چند دن بعد میں بیمار ہوا۔ مجھے میرے دوستوں نے ہسپتال میں داخل کروا دیا تمی کا کیا ہوا مجھے کچھ خبر نہیں

"بہت خط لکھے"

"لیکن"

"کوئی جواب نہ آیا"

یہ تھی وہ ادھوری محبت کی داستان جو غازی نے مصنف کو ایک دن اپنی موت سے پیشتر سنائی۔ اور اصرار کیا کہ اسے "واگہ کے اس پار" کے عنوان سے اس خیال سے لکھا جائے کہ شائد نمی کا کوئی پتہ مل سکے

بھابی

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ ہم چسر ٹیا
گھر: یکھ کر واپس لوٹ رہے تھے میرے ساتھ میرا... دوست حمید
بھی تھا۔ جونہی ہم ملکہ کے بُت کے قریب پہنچے۔ سامنے ایک شخص نظر
آیا لباس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یو۔پی کا رہنے والا ہے۔ دیکھنے میں
اچھا خاصا جوان تھا۔ داڑھی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ چہرہ اچھی طرح
نظر نہیں آتا تھا۔ جا بجا داڑھی پر تھوک نظر آرہا تھا وہ ہمارے نزدیک
پہنچا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو ادھر اُدھر گھما کر میری طرف دیکھا

پھر زور سے پکارا۔

جیو میری جان۔ میری عمر بھی تمہیں لگے۔

حمید نے میری طرف دیکھ کر کہا بھیا آپ کو دعائیں دے رہا ہے اتنے میں وہ ہمارے بہت قریب آپہنچا کہنے لگا او بابو میں تمہیں نہیں کہہ رہا۔ تم میرے کون ہو۔ میں اپنی راشدہ سے مخاطب ہوں۔ سیدھے چلے جاؤ۔ ورنہ تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔ تم پتلونوں والے بابو بڑے خطرناک ہوتے ہو۔ جاؤ راستہ ناپو۔ میری طرف گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔

میں حیران تھا کہ پاگل پتلونوں والے بابوؤں کو اس قدر بُرا کیوں سمجھتا ہے۔ آخر بات کیا ہے میں جاننا چاہتا تھا کہ راشدہ کون ہے۔ اس کی زبان سے یہ لفظ "میں اپنی راشدہ سے مخاطب ہوں۔" ایسے پیارے معلوم ہوتے تھے کہ میں اس کا راز معلوم کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ پاگل کے ساتھ بحث کرنا خطرناک معلوم دیتا تھا میرے دل میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے آگے بڑھنے کو بھی دل چاہتا پھر یہ سوچ کر کہ پاگل میرا گلا ہی نہ گھونٹ دے ہمت جواب دیئے جارہی تھی۔

میں بش شرٹ کو سنوارتا ہوا آگے بڑھا۔ جیب سے دو روپے نکا

نوٹ نکالا اور پاگل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

او بڑے میاں یہ لو دو روپے ۔ روٹی کھانا۔ پاگل نے نوٹ دیکھا اور میری طرف غور سے دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹا۔ مگر اس نے جھپٹ کر نوٹ پکڑ لیا اور کہا:۔

"تم نے پتلون ضرور پہنی ہے۔ مگر تم اُس کی طرح نہیں

وہ نمک حرام تھا"

میں نے ہمّت کر کے پاگل سے پوچھ ہی لیا کہ

"یہ راشدہ کون ہے"؟

چھوڑو بابو تم پوچھ کر کیا کرو گے۔ رستہ ناپو۔ میرے اصرار پر بھی وہ انکار ہی کرتا گیا۔ آخر میں نے جیب سے ایک روپئیہ نکالا پاگل کی طرف بڑھا کر کہا اگر مجھے راشدہ کی کہانی بتاؤ گے تو یہ روپیہ انعام دوں گا۔ روپیہ دیکھ کر پاگل خوش ہوا۔ اور کہانی سنانے کا وعدہ کیا۔ مگر اس شرط پر کہ میں اس کی مدد کروں

بابو میں پاگل نہیں —— میں نے یہ بھیس اس لئے بدلا ہے کہ کہ اپنی راشدہ کو ڈھونڈوں۔ دہلی میں جامع مسجد کے مغرب کی جانب میری کپڑے کی دوکان تھی۔ ایک شام جب میں دوکان بند کر کے واپس جا رہا تھا۔ راستے میں سڑک کے کنارے میں نے ایک

نوجوان کو پڑے دیکھا۔ کبھی کبھی اس کی زبان سے ہائے کے الفاظ نکلتے پہلے تو میں لاپرواہی سے آگے نکل گیا پھر واپس لوٹا اور سوچا کہ دیکھوں بات کیا ہے۔ نزدیک جا کر دیکھا کہ ایک نوجوان کے چند ایک چوٹیں آئی ہیں قمیض پھٹا ہوا ہے اور پیشانی سے خون بہہ رہا ہے۔ اس نے پانی مانگا مگر اس وقت پانی کہاں سے لاتا۔ میں تانگہ لا کر اسے ہسپتال لے گیا بیس روز کے اندر اندر وہ نوجوان تندرست ہو گیا

جب میں آخری دن اسے ہسپتال دیکھنے گیا تو میں نے نوجوان سے پوچھا۔ اب تم کہاں جاؤ گے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آہ کھینچ کر کہا۔ "میں اکیلا ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ میں کہاں جاؤں۔" مجھے اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ چنانچہ میں اسے گھر لے آیا۔

دروازے پر کھڑا کر کے میں اندر داخل ہوا۔ راشدہ کو دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہا۔ اور پھر واپس آ کر اس نوجوان کو جس کا نام ندیم تھا اندر لے گیا۔ اسے ہمارے گھر آئے کوئی چھ ماہ گزر گئے۔ وہ میرے ساتھ دوکان پر آتا۔ غرض کاروبار میں اس نے میری بہت مدد کی۔ میں اس پر بھروسہ رکھنے لگا۔ وہ مجھے بھیا کہہ کر پکارتا۔

غرض ہماری محبت اس قدر بڑھ گئی۔ کہ راشدہ نے کھلے منہ اس کے سامنے آنا شروع کر دیا۔ وہ اسے بھابی کہہ کر پکارتا۔ دہلی میں ان دنوں آزادی کے نعرے لگا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے تھے۔ جنوری کی چھ تاریخ تھی۔ میں نے ندیم کو دس ہزار روپے دے کر سورت بھیجا تاکہ وہاں سے دکان کے لئے کچھ کپڑا خرید لائے۔

اس کی غیر حاضری میرے اور راشدہ کے لئے بڑی پریشانی کا باعث تھی۔ راشدہ دن میں کئی کئی بار کہتی ندیم کا پتہ کرو۔ تار بھیجو تاکہ اس کی خیریت کی خبر معلوم ہو سکے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ راشدہ ندیم کے لئے اس قدر فکر مند کیوں رہتی ہے مگر پھر یہ سوچ کر کہ وہ دیور ہے اور یہ بھابی۔ میں خاموش رہتا۔

اگست کی سات تاریخ تھی رات کو کسی نے میری دوکان کو آگ لگا دی۔ سارا کپڑا جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ ندیم اس قدر رویا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھ سے زیادہ اس کو دوکان کے جل جانے کا صدمہ ہے۔ صبح ہوئی میں نے کہا چلو لاہور چلے چلیں۔ مگر راشدہ نہ مانی۔ کیونکہ ان دنوں لاہور کی حالت تو دہلی سے بھی بدتر تھی چنانچہ خدا پر بھروسہ کئے ہم دہلی ہی میں مقیم رہے مگر کب تک تیرہ اگست کی رات کو ۲ بجکر ۱۰

منٹ پر کسی نے ہمارے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ میں نے کئی بار پوچھا کون ہے مگر کوئی جواب نہ آیا۔ آخر کسی نے کہا باہر نکلو ورنہ آگ لگا دیں گے میں نے سب دروازے بند کر دیئے تمام زیورات اور بیس ہزار روپے کے نوٹ میں نے ندیم کو ایک سوٹ کیس میں رکھ کر دے دیئے۔ اور ہم سب مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ اتنے میں ظالموں نے صحن کا دروازہ توڑ ڈالا۔ دوسرا دروازہ توڑ رہے تھے کہ میں نے راشدہ کو لٹھے کے ایک تھان کے سہارے مکان کی پچھلی طرف ایک تنگ و تاریک گلی میں اتارا۔ پھر ندیم اترا میں اترنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ غنڈوں کے پاؤں کی آہٹ چھت پر چڑھنے والی سیڑھیوں پر آئی۔ میں جھٹ سے چھت پر بنے ہوئے غسلخانہ میں چھپ گیا۔ وہ چھت پر آئے۔ ان کے پاس ٹارچ تھی۔ ادھر ادھر تلاش کر رہے تھے کہ ان کی نظر سامنے۔۔ بندھے ہوئے کپڑے پر پڑی۔ ایک غنڈہ چلا کر بولا۔ لو بھئی شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ چلو تجوری دیکھیں پس وہ نیچے اتر گئے۔ اتنے میں میں بھی بندھے ہوئے کپڑے کا سہارا لے کر نیچے اترا۔ میں ندیم پر الزام نہیں لگاتا۔ کیونکہ ممکن ہے وہ میرا انتظار کرتا۔ تو وہ دونو موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے۔ مگر پھر بھی وہ میرے لئے پانچ منٹ بھی نہ ٹھہر سکے۔ میں نے ٹارچ نکال کر ادھر ادھر دیکھا تو ایک ہزار کے نوٹوں کا ایک بنڈل پڑا ملا۔ عین اس جگہ جہاں میں اترا۔

میں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ وہ کہاں چلے گئے۔ اوپر والے نوٹ پر لکھا تھا "بھیا ہم یہاں ٹھہرے تو قتل ہو جائیں گے۔ ہم جا رہے ہیں لاہور ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔" عبارت پنسل سے لکھی تھی۔ میں اچھی طرح پڑھ بھی نہ سکا۔ خیر میں دہلی کی تنگ و تاریک گلیوں میں سے ہوتا ہوا شہر کے باہر نکلا۔ راستے میں کئی جگہ خطرہ تھا۔ مگر کیا کرتا۔ گڑگانواں جانے والی سڑک کا رخ کیا۔ راستے میں دو تین روز جھاڑیوں میں چھپا رہا بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ ایک شخص سے مانگ کر روٹی کے چند نوالے کھائے اور پھر لاہور کا سفر شروع کیا۔ دن کو چھپا رہتا رات کو سفر کرتا۔ اسی طرح میں امرت سر پہنچا۔ امرت سر کی حالت دیکھ کر میں اور بھی پریشان ہو گیا۔ خدا خدا کر کے جان بچی جتی اکہ میں بڑی مصیبت کے بعد لاہور پہنچ گیا۔ یہاں آکر راشدہ اور ندیم کی تلاش شروع کی مگر وہ نہ مل سکے۔ نقدی ختم ہو گئی۔ نوکری کی تلاش کی تعلیم کم ہونے کی وجہ سے وہ بھی نہ ملی۔ آخر میں نے لاہور کے ایک ایک محلے میں بھیس بدل کر ندیم اور راشدہ کی تلاش شروع کی۔ ایک دن میں نے انہیں پا لیا۔ مگر اڑھائی سال کے بعد وہ تانگہ پر آرہے تھے۔ میں نے بھی تانگہ لیا۔ وہ کیپٹل سینما میں گرہستی دیکھنے آئے تھے۔ میں بھی ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوا۔ ان سے اتنی دور بیٹھا کہ اگر وہ بات کریں تو میں سن سکوں۔ ندیم نے کہا۔ راشدہ

میں جب کبھی سنیما دیکھنے آتا ہوں تو مجھے بھیا یاد آجاتے ہیں۔ ہاں وہ نظارہ جب ہم دونو اکھٹے سنیما دیکھنے جایا کرتے تھے۔ راشدہ غصہ میں آکر بولی۔

"پکچر شروع ہوگئی ہے چپ رہو۔ میں کئی بار کہہ چکی ہوں ان کا نام میرے سامنے مت لیا کرو۔"

دل نے کہا اٹھ کر چلا آؤں۔ پھر سوچا کہ ان کا پیچھا کیوں نہ کروں تاکہ ان کا گھر معلوم کرسکوں۔ ہاں یہ ان کا ایڈریس ہے۔ بس میری کہانی ختم ہوئی۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

میں پریشان تھا کہ میں اس کی کیا مدد کروں۔ میں نے ایڈریس دیکھا اور پاگل کو اپنے دوست کے ساتھ اپنے گھر روانہ کیا اور خود اسی وقت تانگے پہ سوار ہوا اور وہاں پہنچا وہ گھر میں موجود نہیں تھے نوکرانی کہنے لگی۔ وہ دونو نمائش دیکھنے گئے ہیں۔ مگر چھوٹا لڑکا گھر ہی میں ہے —— میں نے لڑکے کا نام پوچھا کہنے لگی —— افضل —— میں نے واپس آکر پاگل کو بتایا کہ وہ گھر میں نہیں تھے البتہ ان کا بچہ گھر پہ تھا۔ اس کا نام افضل ہے۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا افضل۔ کتنا پیارا نام ہے۔ اچھا خدا سلامت رکھے —— بابو میرا نام بھی تو افضل ہی ہے —— شاید وہ سمجھتے ہیں کہ میں مرچکا ہوں —— میں نے پاگل کو نئے کپڑے

پہنائے جنہیں پہن کر وہ ایک اچھا خاصا شریف آدمی لگنے لگا ــــ پھر کہنے لگا دوست میں کراچی جانا چاہتا ہوں وہاں میرے رشتہ دار ہیں۔ میں دوسرے ہی دن اسے کراچی میل پر بٹھا آیا ــــ وہ کبھی کبھی مجھے لکھتا ہے ــــ اور ندیم کے کاروبار کے متعلق پوچھتا ہے اور ہر خط میں لکھتا ہے :-

"بھیا مجھے تو یہ لگتا ہے کہ ندیم اسے بھابی کہا کرتا تھا ــ مگر افسوس اس نے بھائی کا انتظار نہ کیا ــــ"

میں دہلی جاؤں گا

دو گاؤں سے مشرق کی جانب اس ویرانے میں جہاں بڈھا سادھو رہا کرتا تھا ٹھیک ساڑھے نو بجے ۔ آج شام کو ۔"

یہ تھے وہ پیارے الفاظ جو منو کی پیاری زبان سے نکلے اور رات کی تاریکی میں یہ کہہ کر غائب ہو گئے ۔" اے محبت کرنے والو اپنے انجام پہ غور کرو !"

منو محمود کو دل سے چاہتی تھی ۔ مگر ان کے رستے میں ایک رکاوٹ تھی اور وہ تھا مذہب ۔ محمود مسلمان تھا اور منو مسیحی ۔

منو نے محمود کے سنہرے گھنگر دار بالوں میں اپنی نرم پتلی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"محمود کیا ہماری محبّت کامیاب ہو سکے گی۔ کبھی تم نے انجام پر نظر کی ہے۔ کیا ہم دونو اکٹھے رہ کر زندگی کی منزل کی طرف بڑھ سکیں گے"

تم بولتے کیوں نہیں ـــــ جواب کیوں نہیں دیتے ـــ منو نے غمزدہ ہو کر کہا

محمود نے منو کے بکھرے بالوں کو اپنے ہاتھ سے سنوارتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

ضرور جواب دوں گا۔ مگر کل ۔ساڑھے نو بجے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں اٹھے اور اپنے اپنے گاؤں کا رخ کیا۔

نمبردار جی صبح صبح اُٹھے۔ محمود کی ماں کو جگایا۔ تاکہ گھر کا کام سورج چڑھنے سے پہلے ختم ہو سکے۔ خود نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے۔ جب نماز پڑھ کر لوٹے۔ تو محمود ابھی تک سو رہا تھا۔ چلا کر کہا۔ محمود۔ کیا کالج میں تم لوگوں کو یہ ہی تعلیم دی جاتی ہے اٹھو غسل کرو۔ اتنی دیر سوئے رہنے سے تو صحت پر برا اثر پڑتا ہے

محمود آنکھیں ملتا ہوا بستر سے اٹھا۔

پہلا لفظ جو اس کی زبان سے نکلا "محبّت" تھا جوتی پہنی اور یہ

گنگناتا ہوا غسلخانے کی طرف چلا گیا

اکھیاں لگا کے دل ننھا سا چھڑا کے

او جانے والے چھوڑ نہ جانا

وہ آج بہت پریشان تھا۔ جونہی ماں کے پاس باورچی خانے میں گیا۔ ماں نے لسی کا بھرا ہوا گلاس جس میں کم از کم ۲ چھٹانک مکھن تھا اپنے کمزور ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے کہا

"لے میرے لال لسی پی لے۔ کالج میں تو صبح صبح چائے پی کر کلیجہ جلانا ہوگا۔" محمود نے ماں کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر زمین پر رکھ دیا پھر ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا "ماں میں اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں گا جب تک تم میری بات نہ مانو گی"

ماں نے محمود کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بیٹا کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تو کچھ اداس سا رہتا ہے۔ آخر کونسی ایسی مصیبت آپڑی ہے بیٹا۔ وہ کون سی ایسی بات ہے۔ جس کے لئے تو اس قدر پریشان ہے میں تیرے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں"

یہ سن کر محمود کا دل بھر آیا۔ ماں کی محبت دیکھ کر اسے امید کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ مُسکرایا۔ مگر پھر یہ سوچکر کہ منو مسیحی ہے اور وہ مسلمان وہ پھر پریشان ہوگیا۔ اس کے چہرے پر غم کے آثار نظر آنے لگے اس

نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا

"ماں کہنا تو چاہتا ہوں۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ زبان پہ آنے کے بعد اگر میری بات پوری نہ ہوئی تو میں تمہاری ممتا کھو بیٹھوں گا ——— اور عین ممکن ہے تم مجھ سے نفرت کرنے لگو۔"

ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا بیٹا آج تک کون سی ایسی بات ہے جو میں نے نہ مانی۔ میں کوشش کروں گی کہ تیری مدد کروں۔"

محمود سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر کہا:-

"ماں کیا مسیحی لڑکیوں سے محبت کرنا گناہ ہے۔"

یہ سن کر بوڑھی اماں کے تیور بدل گئے۔ غصہ میں آکر بولی۔ تجھے ایسی باتوں سے کیا۔ کیا تجھے بھی کسی مسیحی لڑکی سے محبت ہے۔ پھر ذرا سنبھل کر بیٹا ہم مسلمان ہیں۔ ان کے اور ہمارے مذہب میں بہت فرق ہے اس لئے میری نظر میں یہ ایسا گناہ ہے۔ جو کبھی معاف نہیں ہوگا

یہ سن کر محمود غصہ سے پاگل ہو گیا۔ چلا کر کہا" ماں تم جو مذہب مذہب کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔ مجھے پسند نہیں — مذہب دل کا ہوتا ہے۔ دنیا کی پیدائش کے وقت آدم اور حوا کا کیا مذہب تھا۔

ماں گھبرا رہی تھی۔ سوچا لڑکا جوان ہے۔ فضول بحث سے کیا فائدہ چنانچہ بوڑھی اماں نے پھر لسی کا گلاس اٹھایا اور محمود کو دیتے ہوئے

کہا۔ بیٹا تو سمجھدار ہے۔ ایسی باتیں تیرے لئے مناسب نہیں۔۔ گاؤں بھر کے لوگ تیرے باپ کی عزت کرتے ہیں۔۔ اگلے روز جب ہم نے گاؤں کے غریب لوگوں کے لئے کھانا پکایا۔ تو نمبردار زندہ باد کے نعرے فضا میں گونج رہے تھے۔ بیٹا چل اندر چل کر بیٹھ آج تیرے ماموں آ رہے ہیں۔

محمود اندر چلا گیا اور میز پر پڑے ہوئے مشہور ماہنامہ صحت و زندگی کو پڑھنے لگا۔ مگر ماں پریشان ہو گئی۔ دل ہی دل میں خدا جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ بار بار ماتھے پہ ہاتھ مارتی اور کہتی نہ لڑکے کو کالج کی تعلیم دلواتے نہ لڑکا اتنا آزاد خیال ہوتا۔۔۔ دماغ میں کئی خیال آتے کبھی سوچتی کہ کہیں کالج میں تو کسی عیسائی لڑکی سے محبت نہیں رچا بیٹھا۔ پھر کہتی نہیں ہرگز نہیں۔ میرا بچہ اتنا بیوقوف نہیں کہ ان عیسائی لڑکیوں سے محبت کرتا پھرے اور پھر گاؤں کے نمبردار کا بیٹا۔

محمود اور منو کی پہلی ملاقات دہلی کے ایک ہسپتال میں ہوئی تھی۔ محمود علی گڑھ یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے ہمراہ دہلی آیا ہوا تھا۔ ایک شام جب وہ ڈی اے وی کالج کے ساتھ میچ کھیل کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس اس ہوٹل کی طرف لوٹ رہا تھا جہاں وہ سب ٹھہرے ہوئے تھے تو اس کا سائیکل ایک گڑ سے بھرے ہوئے ٹرک سے کچھ اس طرح ٹکرایا کہ اسکی داہنی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ چنانچہ اس کے دوستوں نے اسے

ہسپتال داخل کرا دیا۔

محمود کی حالت بڑی خراب تھی۔ اس نے پاس کھڑے ایک نوکر کو کہا بھیّا ذرا نرس کو بلا لاؤ۔ میری ٹانگ میں بڑا سخت درد ہے مجھے نیند نہیں آتی۔ نوکر گیا اور پھر واپس آ کر محمود سے کہا جناب آج نرسوں کی ڈیوٹی تبدیل ہونے والی ہے۔ نئی نرسیں کھڑی ڈاکٹر کے پاس کچھ بات چیت کر رہی ہیں۔ ابھی آتی ہیں۔ کوئی دو منٹ گزرے چار خوبصورت لڑکیاں اندر داخل ہوئیں — ان میں سے ایک تو بلا کی حسین تھی۔ نوکر آگے بڑھا اور منو کے پاس جا کر بولا مِس صاحبہ سامنے والے بابو آپ کو بلاتے ہیں

منو — "چپ رہ۔ ابھی تو میں اندر داخل ہوئی ہوں۔ انہیں کہہ دو کہ خاموش بستر پہ لیٹے رہیں۔"

نوکر۔ "انہیں بڑی تکلیف ہے"۔

یہ سن کر منو محمود کو دیکھنے آئی۔ اور دیکھتے ہی اسے خیال آیا کہ یہ لڑکا تو اس کے قریب والے گاؤں کا ہے۔ پھر سوچا اسے بتانے سے کیا فائدہ۔ خیر منو نے محمود کو دوا پلائی چنانچہ وہ چند ہی منٹ کے بعد سو گیا۔

منو بار بار اس کی پیاری شکل دیکھتی۔۔۔ اور جتنا ہی اُسے

دیکھتی اتنی ہی پریشان ہوتی جاتی۔ دو ہی روز میں وہ محمود کی بیماری کو اپنی بیماری سمجھنے لگی تھی۔

آج منو کا وارڈ میں تیسرا روز تھا۔ جب شام کو ہوسٹل واپس آئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو بار بار اپنے آپ سے پوچھتی۔ ہوسٹل اچھا ہے یا ہسپتال۔ یا ربار گاتی ہے

مجھے کسی سے پیار ہو گیا

محمود کو ہسپتال میں آئے ہوئے ایک ماہ گزر چکا تھا اب اسکی حالت کچھ بہتر تھی۔ منو نے اس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ڈیوٹی کے بعد بھی وہ اسے کئی بار دیکھنے آتی۔ منو محمود کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا دل میں سوچتا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ مسکرا کر کہا۔ "میا بابا آپ کا دولت خانہ کہاں ہے۔" منو اس ادا سے کہ گویا غصہ میں ہے۔

"او بابو ذرا منہ سنبھال کر بولو مجھے پھر میا نہ کہنا میرا نام منو ہے۔"

محمود نے دو دفعہ آہستہ آہستہ منو کہہ کر پکارا۔ منو۔ اس کا بخار جو آج اترا ہوا تھا۔ دیکھ کر آگے بڑھی۔ اس نے محمود کو منو کہتے ہوئے سن لیا تھا ___ وہ مسکرائی اور اپنے کام میں مصروف

ہوگئی۔

ہاں اب تیر کلیجے کے پار ہو چکا تھا۔ غرض چند ہی دن میں ان کی محبت اس قدر بڑھ گئی کہ محمود تندرست ہونے کے باوجود بھی ہسپتال ہی میں رہا۔

ایک دن باتوں باتوں میں محمود نے پھر منو کو وہی سوال پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے جب منو نے گاؤں کا نام بتایا۔ تو محمود نے منو کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "واہ رے میری نرس۔ جناب نسی تے ساڈے گوانڈھی ہی نکلے"۔

اب محمود تندرست ہو چکا تھا چند دن تک خوب دہلی کی سیر کی ۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو جب وہ دونوں واپس آ رہے تھے۔ تو محمود بار بار منو سے ... کہتا منو جمنا کے کنارے بیٹھ کر گائے ہوئے گیت مجھے عمر بھر نہ بھولیں گے۔ جب گاڑی انبالہ پہنچی تو اسٹیشن پر گولیاں چلنے لگیں۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ تمام پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ محمود اور منو نے اپنا سارا سامان گاڑی ہی میں چھوڑا اور خود پیدل چل پڑے۔ بہت جدوجہد کے بعد انبالہ شہر سے باہر نکلے۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد وہ دونوں لاہور پہنچے۔ ایک دن لاہور ایک دوست کے ہاں ٹھہرے مگر دوسرے ہی دن

اس خیال سے کہ لاہور میں خطرہ ہے انھوں نے اپنے گاؤں کا رُخ کیا محمود اور منو کے گاؤں میں دو چار فرلانگ کا فاصلہ تھا دونوں دیہاتوں کو ایک چھوٹی سی نہر جدا کرتی تھی۔ چنانچہ رات کی گہری تاریکی میں کئی کئی گھنٹے ملاقاتیں ہوئیں۔ آج منو کی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ وہ دہلی جانے سے پہلے آج رات کو نو بجے محمود کا فیصلہ سننا چاہتی تھی۔

پاکستان بن چکا تھا۔ مگر عیسائی چونکہ ادھر ادھر جا سکتے تھے اس لئے محمود نے بھی منو کو یہی رائے دی کہ وہ واپس دہلی چلی جائے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر ماں باپ نہ مانے تو وہ بھی پاکستان سے ہندوستان چلا جائے گا۔ دوسرے وہ بار بار یہی کہتا کہ یہ حالات زیادہ دیر نہیں رہیں گے

چنانچہ آج کی ملاقات ان کی آخری ملاقات تھی۔ منو نہر کے کنارے میں اکیلی بیٹھی اپنے محمود کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ خوش تھی کہ آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ آخر محمود آیا۔ مگر نہ آتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس کے ماں باپ اسے کہہ چکے تھے کہ اگر وہ کسی عیسائی لڑکی سے شادی کرے گا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انجام اچھا نہ ہوگا ـــــ

آج منو جاننا چاہتی تھی کہ محبت جیتتی ہے یا مذہب۔

محمود نے منو کا ہاتھ پکڑ کر کہا منو مجھے تمہاری محبت کی قسم میں سوائے تمہارے کسی دوسری لڑکی سے شادی نہ کروں گا۔

غرض دونوں نے ماں باپ کی مخالفت کے باوجود بھی عہد و پیمان کئے اور کوئی گیارہ بجے رات اپنے اپنے گھر لوٹے۔ مگر منو کے دل کو تسلی نہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس ہی پریشانی میں ساری رات نہ سو سکی ۔۔۔ صبح سویرے محمود کے باپ نے اسے بلایا۔ اور اُسے اس کے ماموں کے ساتھ لاہور جانے کو کہا۔ مگر محمود نے صاف انکار کر دیا کہنے لگا۔ ابا جان خدا خدا کر کے تو پاکستان پہنچا ہوں۔ ٹانگ میں اب بھی کبھی کبھی درد محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے آرام کی ضرورت ہے ۔ میں اب گاؤں کی آب و ہوا کو پسند کرتا ہوں۔ یہ سن کر محمود کا ماموں ہنس پڑا۔ کہا بیٹا میرا صرف یہ خیال تھا کہ تو اس ہی سال بی۔ اے کر لیتا۔ کیونکہ ہم نے تیری شادی دسمبر میں طے کی ہے۔ تو واپس علیگڈھ تو نہ جا سکے گا۔ یہاں ہی پنجاب یونیورسٹی میں امتحان دے دینا۔ نیا نیا ملک ہے کسی بڑے عہدے پر لگ جائے گا۔

یہ سن کر محمود کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔۔۔ رنگ زرد ہو گیا۔ غصہ میں آ کر بولا۔

”بس ماموں جان آگے کچھ نہ کہئے۔ میں کسی کی امانت ہوں“

نمبردار جی یہ سن کر غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ محمود کے منہ پر چپت رسید کرتے ہوئے کہا

"بیوقوف بڑوں کے سامنے زبان کھولتا ہے"۔ محمود نے گرتے ہوئے دن کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہا۔ کہ وہ ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا۔ تو وہ زہر کھا لے گا"۔

یہ سن کر بوڑھی ماں غصے میں آ کر بولی :۔

"ارے چُپ رہ لڑکے کئی دیکھے تجھ جیسے زہر کھانے والے"

منو نے دہلی پہنچکر محمود کو کئی خط لکھے۔ وہ لگاتار جواب دیتا رہا مگر ملکی اور سیاسی حالات کی وجہ سے وہ دہلی نہ جا سکا۔

بھارت اور پاکستان کے تعلقات خراب ہوتے گئے۔ محمود کی شادی زبردستی کر دی گئی۔ اس کی شادی کا پہلا روز تھا۔ جب دوسرے گاؤں کے کسی شخص نے اسے بتایا کہ منو نے گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کر لی ہے۔ مرتے وقت اس کی جیب سے ایک خط ملا۔ جس میں بار بار لکھا تھا۔ "آج محبت پر مذہب غالب آ گیا"۔

یہ سنتے ہی محمود کا سر چکرانے لگا۔ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی بار بار کہتا۔ منو یہ تو نے کیا کیا۔ میں حالات بہتر ہوتے ہی دہلی چلا آتا تو نے ایسے کیوں کیا۔ اسی خیال میں وہ پاگل ہو گیا۔ ایک دن منو

کے گاؤں جا نکلا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سر میں راکھ تھی۔ منہ سے تھوک بہہ رہا تھا۔ بچوں کے پیچھے دوڑتا۔ بچے پتھر مارتے۔ تو قہقہے لگاتا اور زور زور سے کہتا

"آج محبت پہ مذہب غالب آگیا"

اس روز جب وہ شام کو گاؤں واپس لوٹا تو جسم پہ جا بجا زخم تھے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ چنانچہ اسے پاگل خانے پہنچا دیا گیا——

کہتے ہیں ان دنوں وہ سندھ کے پاگل خانہ کی چار دیواری میں قید ہے۔ لوہے کے مضبوط سلاخوں والے ایک کمرہ میں بند ہے کبھی کبھی ان سلاخوں کو زور زور سے کھینچتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے "منو میں تیرے پاس آرہا ہوں" پھر بیٹھ کر منو کا نام فرش پر انگلی سے لکھتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے

"میں واہگہ کی سرحد توڑ ڈالوں گا۔ آؤ مجھے روکو—— میں دہلی جاؤں گا۔ اور اس وقت تک واپس نہ آؤں گا جب تک اپنی منو کی قبر پہ پھول نہ چڑھاؤں"

شادی شدہ

ننھے زاہد کے نام

جس نے کار میں سے منہ باہر نکالا اور چلا کر کہا۔ ہم واپس آئیں گے۔ ہم پاکستانی ہیں۔ "پاکستان زندہ باد"۔ یہ الفاظ سن کر کسی نے ننھے پر گولی چلائی جو اس کے دل پر لگی۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے "میں پاکستانی ہوں"۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گیا ——

شادی شدہ

میں نے "نجمہ" کو اپنے دفتر میں اس لئے رمینجر کی حیثیت نہیں دے رکھی تھی کہ وہ مجھ سے محبّت کرے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کی شرافت تھی۔ اس کے علاوہ وہ سماج کے سرد و گرم سے واقف اور اس کے آداب سے آگاہ تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھ سے باتوں باتوں میں مذاق اور قدم قدم پہ چھیڑ خانیاں کرتی۔ حالانکہ یہ تو اسے پہلے ہی دن سے معلوم تھا کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میں ایک بچے کا باپ ہوں۔ .... ویسے تو ہر روز دفتری کاروبار کے سلسلے میں بیسیوں ملاقات کے مواقع تھے لیکن "نجمہ" کسی بیرحاصل ملاقات کی تلاش میں رہتی۔ جب کبھی اس کا میرے پاس سے گزر ہوتا۔ تو چلتی چلتی اپنے مخصوص معصومانہ انداز میں مسکراہٹیں پیش کرتی جن کو

میں عقیدت مندانہ تبسم سے نوازتا، تمام دن انہی دلچسپیوں اور تبسم ریزیوں میں گزر جاتا۔ . . . . . . کبھی کبھی میری طبیعت اداس ہو جاتی اور میں ان ہنگامی دلچسپیوں سے اُکتا جاتا اور بے ساختہ میری زبان سے یہ الفاظ نکل جاتے "نجمہ" وہ ساز جن کے تار ٹوٹ چکے ہوں ان سے سنگیت کی امید رکھنا بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک دن میرے سر میں درد تھا اور درد بھی کچھ اس شدت کا کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے مجبور ہو کر اپنا سر سامنے۔۔۔۔ پڑے میز پہ رکھ دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ نجمہ کو میری اس حالت سے کس نے آگاہ کیا شاید دفتر کے چپڑاسی نے رسمی طور پہ بتایا ہو۔ جیسے عموماً دفتروں میں ہوتا ہے۔ . . . . . . ابھی آدھ گھنٹہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ایک سہمی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی

"رشید صاحب! اجازت ہو تو میں بھی آپ کی پریشانی میں حصّہ لوں۔"

میں تیوڑی چڑھا کر بولا "تمہیں روکتا کون ہے"۔ لیکن وہ فوراً کاغذات کا پلندہ میز پہ رکھ کر سامنے کی کرسی پہ میری طرح میز پر سر ڈال کر بیٹھ گئی۔ مجھے نجمہ کی اس بیباک حرکت پر طیش آیا۔ اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے اوورکوٹ کو اپنے کندھوں پہ ڈالتے

ہوئے کہا بہت کم لوگ ہیں جو حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں .... میرے یہ الفاظ سن کر نجمہ اٹھ بیٹھی اور میرے سامنے کھڑی ہو کر بولی: "کیسے لوگ اور کیسی حقیقت حضور" یہ حقیقت نہ تھی تو اور کیا تھا؟ میں تو سچ کہوں گی۔ خدا جانے آپ کس دھن میں محو تھے لیکن میں تو فقط آپ کے لیے دعا مانگ رہی تھی اور یہ حقیقت ہے۔ نجمہ نے کئی بار میرا رستہ روک کر مجھ پر یہ سوال کیا۔ کہ آج کیا بات ہے آپ بولتے کیوں نہیں؟ اُف تمہاری غلط فہمیاں دوسرا دردِ سر ہو کر ٹھہریں۔ یہ سنتے ہی نجمہ نے اپنی ملول نگاہیں اوپر اٹھا کر پوچھا کہ "اجی! وہ پہلا دردِ سر کیا ہے؟ تمہیں کیا میں مر دل یا جیئوں تمہاری بلا سے" نجمہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجھ سے اپنی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس مرتبہ وہ کچھ اس مرغوب انداز سے بولی کہ میرا دل پسیج گیا۔ اور میں انکار نہ کر سکا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے اپنی مخملی ہتھیلیاں میری کنپٹیوں پر رکھ کر اپنی نرم و نازک انگلیوں کو میرے ماتھے پر پھیلا کر اس زور سے دبایا کہ میں درد کے مارے چیخ اٹھا "ہائے میں مر گیا" یہ سنتے ہی نجمہ کے ہاتھ ڈھیلے ہو گئے۔ اس کی پھیلی ہوئی انگلیاں سمٹ گئیں اور اس کی نرگسی آنکھوں سے آنسو گر پڑے

جو کسی پوشیدہ راز کی ترجمانی کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا "نجمہ یہ کیا؟ لیکن وہ ایک پتھر کی مورت کی طرح خاموش رہی جب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ تو نجمہ نے شرما کر اپنے دوپٹے کے آنچل سے اپنا منہ چھپا لیا اور اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔۔۔۔۔۔

اتنے میں مَیں نے قلمدان میں سے اپنا قلم اٹھایا اور ابھی لکھنا بھی شروع نہ کیا تھا کہ وہ پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور جھٹ سے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔ میں حیران ہو گیا کہ آج نجمہ کو کیا ہو گیا ہے اور آخر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟۔۔۔

۔۔۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے کہا کہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر بات کرو۔ اس طرح میری طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے۔ خیر وہ مان گئی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ "ارشاد فرمایئے"۔ میں نے پہلے نہایت دردمندانہ نگاہوں سے نجمہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنی نظروں کو سامنے کے پرانے کیلنڈر پر گاڑ کر کہا۔

"نجمہ! میری شادی ہو چکی ہے۔ اور میں ایک بچے کا باپ ہوں لوگ مجھے چلتا پھرتا دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ مجھ میں زندگی ہے۔ لیکن نجمہ میری حالت مردے سے بھی بدتر ہے۔ مجھے اپنی خبر نہیں کہ میں کہاں ہوں اور بالآخر میری زندگی کا کیا حشر ہو گا میری انسانیت بار بار

مجھے اس بات پر مجبور کر رہی ہے۔ کہ میں تمہیں صاف بتا دوں کہ جن ارمانوں کا دامن تم تھامے بیٹھی ہو۔ وہ آج سے دو سال پیشتر پھٹ چکے۔ ان کے تمام تار بوسیدہ ہو چکے ہیں" میں نے تو یہ الفاظ کسی اور مطلب کے لئے کہے۔ لیکن اس نے ان کو کچھ اور معنی پہنا دیے۔ جھٹ سے بول اُٹھی

"میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں سوزن کاری کا کام سیکھا ہے سینے پرونے کے مضمون میں ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل رہا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی رفوگری۔ اس اعلیٰ درجہ کی جانتی ہوں۔ کہ آصف رفوگر تک میرے فن رفوگری کا دم بھرتے ہیں میرا تو یہاں تک دعوےٰ ہے کہ اگر ان دامنوں کو تار تار بھی کر دیا جائے تو میں انہیں اس طرح رفو کر سکتی ہوں کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں ایک بار ضرور دھوکا کھا جائیں" ......

ابھی میں رکنے کا اشارہ نہ کرتا۔ تو خدا جانے یہ رفوگری کی داستان کہاں تک پہنچتی۔ میں نے پھر کہا

"تجو میں شادی شدہ ہوں میرے دل کے تار تو پہلے ہی ٹوٹ چکے ہیں میں تمہیں تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتا، میں نے اسی قسم کے دو چار فقرے اور کہے۔ لیکن نتیجہ برائے نام۔ ہاں ہاں کرتی رہی اور لہلہاتی جنت کی

طرح جھومتی جھامتی پھر میری کرسی کے قریب آکھڑی ہوئی۔ بائیں گھٹنے
میں خم ڈال کر میرے کندھے سے سہارا لے کر بولی:۔
"رشید صاحب! آپ کے یہ الفاظ میرے ارادوں کو نہیں
بدل سکتے۔ محبت کسی کے ارادوں کی محتاج نہیں۔ وہ کسی کی مجبوریوں کی
پرواہ نہیں کرتی"۔ . . . .

میں غصے میں آکر اٹھ کھڑا ہوا میرا چہرہ تمتا اٹھا میں نے گرج کر کہا
"نجمہ! برباد ہو جاؤ گی۔ میں نہیں چاہتا کہ میں تمہاری بربادی کا موجب
ٹھہروں"۔ میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ وہ بچوں کی طرح زار زار رونے لگی۔
میں اس فکر میں غرق تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے لوگ مجھے کیا کہیں گے
اتنے میں میرا ننھا زاہد آپا آپا کہتا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ
نجمہ کو اسلام علیکم کہہ کر میری کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن میں شرم کے مارے
پانی پانی ہو گیا۔ اتنے میں نجمہ نے زاہد کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے سر پہ
ہاتھ پھیر کر کہنے لگی۔ "زاہد تم بہت پیارے ہو"۔ زاہد نے فوراً نجمہ
کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر اپنی توتلی زبان میں کہا۔

"میرے آپا بھی بہت پیارے ہیں" یہ سنتے ہی نجمہ نے زور سے
قہقہہ لگایا اور اپنے بازوؤں میں دبا کر کئی بار زاہد کو پیار کیا۔ ۔

. . . . بچوں کی فطرت ہے کہ جو انہیں کھانے پینے کی چیزیں دے

ان کی کھیلوں میں حصہ لے یا اس کے علاوہ ان سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کرے یہ اسی سے ہل مِل جاتے ہیں۔ زاہد اور نجمہ آپس میں باتیں کرتے رہے اتنی دیر میں میں گھر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور زاہد کو پکارا۔ آؤ بیٹا! گھر چلیں۔ زاہد نے اپنے طفلانہ انداز میں بگڑ کر کہا " میں نہیں جاؤں گا "۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر زاہد کو لینے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر زاہد نہ آنے کی ادا سے نجمہ سے لپٹ گیا۔ میں یہ دیکھ حیران ہوا اور یہ کہتے ہوئے قدم اٹھایا کہ " زاہد میں چلا ہوں "۔ میں نے تو اس غرض سے کہا کہ شاید زاہد ڈر جائے گا کہ ابا چلے گئے تو میں اکیلا رہ جاؤں گا لیکن وہ کہنے لگا " جایئے میں ان کے ساتھ گھر آجاؤں گا۔ اِدھر زاہد نے یہ کہا اُدھر مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے آنے والی مصیبت کے بھیانک سائے نظر آنے لگے۔ . . . . چند ے توقف کے بعد میں کشمکش کے عالم میں پکار اٹھا " باپ بیٹا ایک ہی زنجیر میں جکڑے گئے دونوں پہ ایک ہی بجلی گری . . . . . . اچھا چلو ان کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں . . . . . پھر اسی وقت سامنے کے اڈے سے تانگہ لے آیا میں سامنے بیٹھ گیا نجمہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اور زاہد دونوں نشستوں کے درمیانی حصے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کھڑا ہوتے ہی تانگے والے کو

چلو کا حکم دیا۔

ابھی آدھا سفر بھی طے نہ ہونے پایا تھا کہ چپڑاسی سائیکل پر سوار بڑی تیزی سے آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے تانگے والے کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا تانگہ ٹھہر گیا۔ اتنے میں وہ پہنچ گیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کیا بات ہے۔ چپڑاسی بولا:۔ "حضور کراچی سے ایک صاحب آئے ہیں وہ آپ سے کچھ بات چیت کرنا چاہتے ہیں میں اس تانگے سے اتر کر دوسرے تانگے پر سوار ہو گیا۔ اور نجمہ کو کہا کہ مجھے معاف فرمایئے۔ . . . . برائے نوازش زاہد کو گھر چھوڑ دیجئے گا" نجمہ بہت اچھا کہنے ہی والی تھی کہ زاہد بول اٹھا ہاں ہاں ہم دونوں چلے جائیں گے۔ اب زاہد قدم قدم پر تانگے والے کو راستہ بتاتا اور نجمہ کی طرف فاخرانہ نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا پڑتا۔ . . . . . .

نجمہ اور زاہد گھر پہنچ گئے۔ چوکیدار نے بھاگ کر صحن کا پھاٹک کھول دیا زاہد نے امی امی کہہ کر چلانا شروع کیا۔ سعیدہ بھاگ کر باہر نکلی اندر جا کر زاہد کی امی کو بتایا۔ . . . . .

عابدہ اکیلے زاہد کو دیکھ کر گھبرا رہی تھی کہ اتنے میں نجمہ نے السلام علیکم کہہ دیا۔ عابدہ نے نہایت سنجیدگی سے وعلیکم السلام کہہ کر جواب دیا اتنے میں زاہد بول اٹھا۔ امی ابا ٹھہر کر آئیں گے۔ اور امی ایک بات اور ہے کہ آج نجو امی بھی یہیں ٹھہریں گی انھوں نے مجھے بہت سی

چیزیں کھلائیں تھیں۔ عابدہ تاڑ گئی کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ خیر ناواقفیت کی وجہ سے خاموش رہی

زاہد اچھل کر ماں کے پاس چلا گیا اور نجمہ ماتھا چڑھا کر بولی۔ دیر مت کرو، تانگے والے نے ابھی لگام کو جھٹکا ہی دیا۔ تو زاہد رونے لگا امی امی ان کو جانے دو۔ عابدہ نے نجمہ سے درخواست کی آئیے آپا۔۔۔۔

عابدہ نجمہ کو لے کر ڈرائینگ روم میں لے گئی۔ دونوں مغربی جانب کے علوفے پہ بیٹھ گئیں

عابدہ کو مجھ پہ کئی دنوں سے شک تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں نجمہ سے محبت کرتا ہوں اور شک تھا بھی صحیح۔ بیٹھتے ہی عابدہ نے تیور بدل لئے تاکہ وہ نہایت حلیمانہ انداز میں میرے اور نجمہ کے پوشیدہ تعلقات کو معلوم کر سکے۔ سعیدہ کو بلا کر فوراً چائے تیار کرنے کا حکم دیا چائے تو پہلے ہی تیار تھی وہ آن بھر میں چائے ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ سعیدہ کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر عابدہ نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نعمتی المارہی کی چابی نکالی اور سعیدہ کو دے کر کہا۔ المارہی کھول کر چند چھوٹے کیک، کچھ پیسٹری، چند کریم رول، گلاب جامن اور نمکین سویاں نکال کر لاؤ پھر رُخ بدل کر نجمہ سے کہا۔ "کہئے آپا آج کل کمپنی کا کاروبار کیسا چل رہا ہے چند دنوں سے زاہد کے ابا تو کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں میں تو

یہ خیال کرتی تھی کہ شاید آج کل کاروبار اچھا نہیں"۔ . . .

"نہیں نہیں کاروبار ترقی کر رہا ہے پاکستان کے بچے بچے کی زبان پر رشید کمپنی کا نام ہے۔ ہماری چیزیں نہایت خوبصورت اور پائدار رہیں پھر موزوں قیمتیں، اور ایک دام۔ سارا دن خریداروں کی بھیڑ سی لگی رہتی ہے آپ جانتی ہیں کہ میں تو کمپنی کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہوں رشید صاحب یونہی پریشان رہیں تو ان کی مرضی، آپ سے تو ناراض نہیں" نجمہ نے مسکرا کر کہا۔

نجمہ کا اتنا کہنا ہی تھا کہ عابدہ کا اندر ہی اندر کلیجہ جل گیا۔ لیکن اس نے اپنے آداب و اطوار کی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ پہلے کی نسبت نجمہ کی باتوں میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا نجمہ نے جب چائے پی کر پیالہ میز پر رکھ دیا تو عابدہ نے ظاہردارانہ محبت بھرے لہجے میں ایک اور پیالہ نوش فرمانے کی درخواست کی نجمہ نے بہتیرا انکار کیا۔ لیکن عابدہ برابر تقاضا کرتی چلی گئی۔ اور خود پیالے میں چائے اور دودھ ڈال کر چینی دان پیش کیا۔ نجمہ نے ایک چمچہ چینی کا ڈال لیا۔ تو عابدہ نے نمکدان پیش کیا۔ نجمہ نے پوچھا یہ کیا ہے؟

عابدہ نے کہا نمک ہے"۔ یہ سنتے ہی نجمہ نے نہایت ظریفانہ لہجے میں کہا۔ "آپ کا نمک آپ ہی پر حلال ہو"۔ . . .

کیوں آپا! آپ پسند نہیں کرتیں میں نے تو اس غرض سے پیش کیا تھا کہ بعض لوگ نمکین چائے بہت پسند کرتے ہیں"۔

"ہاں ہاں یہ آپ بجا فرماتی ہیں"۔ نجمہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس گھر کا نمک میری تقدیر میں کہاں؟" ۔ ۔ ۔ ۔

نہیں نہیں! آپ ہرگز ایسا خیال نہ کریں۔ آپ گاہے گاہے ضرور یہاں تشریف لایا کریں اور مجھے خدمت کا موقع دیا کریں"۔

عابدہ ابھی فقرہ بھی مکمل نہ کرنے پائی تھی کہ نجمہ نے اپنی بائیں کلائی کو اٹھا کر گھڑی پر نظریں جما دیں۔ اس کے بعد عابدہ کیطرف دیکھ کر کہا۔

"عابدہ آپا! دل تو نہیں چاہتا کہ آپ کی رنگین صحبت چھوڑ کر جاؤں لیکن مجھے وقت مجبور کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان نوازشوں کے لئے میں آپ کی نہایت شکرگزار ہوں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نجمہ اور عابدہ دونوں چلتی چلتی باہر کے پھاٹک تک آگئیں۔ اتنے میں ایک تانگہ ادھر آنکلا اور پوچھنے لگا۔ بی بی جی تانگہ چاہیئے، عابدہ نے کہا ہاں ہاں، نجمہ نے محبت بھری فضاؤں کی مسکراہٹوں میں ذرا آگے بڑھ کر کہا" اچھا اب مجھے اجازت دیجئے، السلام علیکم۔

(۲)

اگلے دن میں ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ ایک بوڑھا ایک نیلے رنگ کا لفافہ ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا اور السلام علیکم کہہ کر ہاتھ بڑھایا میں نے وعلیکم السلام کہہ کر لفافہ لے لیا۔۔۔ میں لفافہ اور اس پہ جو میرا پتہ لکھا تھا دیکھ کر سمجھ گیا کہ .... آخر لفافہ کھولا جس میں یوں لکھا تھا

پیارے رشید

السلام علیکم

کل شام میں زاہد کو گھر چھوڑنے کے بعد اپنے گھر پہنچی تو دیکھا کہ مہمانی صاحبہ گھر میں موجود ہیں جس سلسلے میں وہ تشریف لائی ہیں۔ میں خوب واقف ہوں۔ چنانچہ آج شام سات بجے اپنی نجمہ کے غریب خانہ پر تشریف لا کر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں شام کا کھانا یہیں تناول فرمائیے گا۔ باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔

جملہ حالات بدستور

الراقمہ

آپ کی "نجمہ"

میں خط پڑھ کر بڑی دیر تک پس و پیش کے عالم میں رہا ......
دل ہی دل میں کہتا "بیٹا یہ ضیافتیں تمہیں ایک نامعلوم اندھیرے کی طرف لئے جا رہی ہیں!" بوڑھا میرے چہرے پر ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا خدا جانے اس نے میرے چہرے کے ادلتے بدلتے تیوروں سے کیا اندازہ لگایا، بہر کیف میں نے مجبور ہو کر ایک کاغذ کے ٹکڑے پر یوں لکھ دیا

"نجمہ"

وعلیکم السلام

دعوت کے لئے شکریہ - لیکن سچ پوچھو تو میں اس دعوت کے لئے رضامند نہ تھا یہ محض تمہاری ضد ہے جسے میں پورا کر رہا ہوں "تاکہ کم از کم میری کسی حرکت سے تمہارے جذبات کو ٹھیس نہ لگے. باقی رہا کھانا یہ ایک بے جا تکلف ہے جسے مجھ ایسا انسان ہرگز برداشت نہیں کر سکتا. تم میری خودداری سے خوب واقف ہو. کہ میں تکلفات اور تصنوعات کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں. کیونکہ یہی وہ چیزیں ہیں جو یا غیرت انسانوں میں طرح طرح کی کمزوریاں پیدا کر دیتی ہیں اور جب ایسی کمزوریاں خوبیوں پر غالب آ جائیں. تو انسان میں غلامانہ ضمیر پیدا کر دیتی ہیں جس کا بعد ازاں کوئی علاج نہیں ہو

سکتا۔ خیر میں حاضر خدمت ہونے کی کوشش کروں گا۔"

تمہارا رشید

بڈھا خط لے کر چلا گیا۔ اور میں ایک نامعلوم عرصے کے لئے گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ..... بار بار یہ فقرات میری زبان سے نکل جاتے "نجمہ" تم کیوں میری جان پر نار یکیوں کے پردے پھیلا رہی ہو۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں "شادی شدہ ہوں"۔ تمہارا یہ تعاقب بے معنی ہے۔ اگر تم زر کی خاطر مجھ پر قابو پانا چاہتی ہوں۔ تو وہ حاضر ہے۔ لیکن میں عابدہ کی امانت ہوں تمہارا کوئی حق نہیں کہ تم عابدہ کی امانت پر ڈاکہ ڈالو، اف نجمہ . . . .

میں انہی خیالات میں غرق بیٹھا رہا۔ ادھر سامنے کی گھڑی نے چار بجے کا اعلان کر دیا۔ چار و ناچار اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف روانہ ہوا دفتر سے نکلتے ہی حسب معمول ارادہ تھا کہ تانگے پر بیٹھ جاؤں، مجھے سڑک کے کنارے چلتے دیکھ کر ایک تانگے والا تانگہ لے آیا، راستے میں بیسیوں مرتبہ اس نے مجھے یاد دلایا کہ حضور سواری حاضر ہے۔ میں ہر بار یہی کہہ دیتا ہاں بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ اسی طرح ہاں ہاں کرتا سگریٹ پیتا۔۔۔۔ گھر پہنچ گیا۔ میں تانگے والے کو کرایہ نکال کر دے رہا تھا کہ عابدہ نے دیکھا اور میرے پاس آ کر کہا کیا بات ہے آج آپ دیر سے کیوں آئے؟ میں تو خاموش رہا۔ لیکن کم بخت تانگے والا پکار اٹھا آج خدا جانے حضور

کس سوچ میں ہیں۔ دفتر سے لے کر یہاں تک میں ان کے ساتھ آیا ہوں۔ میں نے ہر قدم پر ان کو تانگے پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ لیکن نہ جانے آپ کیوں نہیں بیٹھے۔ اسی لئے دیر ہو گئی ہے۔ تانگے والا تو اپنا کرایہ لے میرے برخلاف بیان دے کر رخصت ہوا اور ادھر مجھ پر سوالات کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"بولتے کیوں نہیں؟ آخر کیا بات ہے؟ کسی سودے میں گھاٹا تو نہیں پڑ گیا؟" آپ ہرگز ہرگز فکر نہ کریں۔ روپیہ آنے جانے والی چیز ہے۔ زندگی ہو تو سب کچھ ہے۔ لیجئے چائے پی لیجئے۔"

جس کی جتنی کائنات ہوتی ہے اتنا ہی وہ سوچ سکتا ہے۔ اچانک عابدہ بولی۔ سنئے "آج ذاکر کی بہن ہمارے گھر آئی۔ گھنٹوں یہاں بیٹھی رہی۔ کہنے لگی کہ ریوالی میں راجکپور کی "برسات" لگی ہوئی ہے اور پھر جس پکچر میں نرگس نے کام کیا ہو وہ تو میں ضرور دیکھتی ہوں۔ آج ذاکر اس کی بیگم اور بہن بھی تو جا رہے ہیں موقع اچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا جاتے وقت ہمیں بھی لیتے جایئے وہ مان گئی۔ جلدی کریں چائے پی لیں وہ آنے ہی والے ہوں گے۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "دیکھو عابدہ! مجھے اور مجبور نہ کرو میں پہلے ہی مجبور ہوں۔ تم چلی جاؤ"۔ عابدہ جھنجھلا کر بولی۔ میں زبان دے

چکی ہوں۔ وہ کیا کہیں گے۔ آپ تو ہمیشہ کسی نہ کسی سوچ میں ہی پڑے رہتے ہیں۔ خدا جانے کتنے دن اور باقی ہیں .... اچھا ہے آپ کی طبیعت بھی بہل جائے گی۔ خیالات تبدیل ہو جائیں گے۔ اسی لئے تو یہ دل لگی کے سامان مہیا کئے گئے ہیں ورنہ زندگی تو ان کے بغیر بھی گزر جاتی ہے .... ویسے بھی تو انسان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کبھی کبھار کہیں ذکر ہوتا ہے تو انسان کہہ دیتا ہے کہ ہاں وہ تصویر اچھی ہے لوگوں پر اثر پڑتا ہے۔ کہ یہ بھی اچھے خاصے انسان ہیں.....

اگر انسان کی انسانیت محض سینماؤں کے پردوں پر چلتی پھرتی تصویریں دیکھنے پر ہی موقوف ہے تو مجھے معاف فرمائیں۔ میں ایسی انسانیت سے باز آیا۔ میں تو شامت کا مارا کہہ ہی بیٹھا عابدہ ایسی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑی کہ جان چھڑانا مشکل ہو گئی....... مجھے بار بار خیال آتا کہ اگر میں چلا گیا تو نجمہ کیا کہے گی....... اگر عابدہ "برسات" دیکھنے کا پروگرام بنا چکی ہے۔ تو میں تحریری وعدہ دے چکا ہوں.... اگر عابدہ کی عزت بچ گئی تو میری آبرو غارت ہو جائے گی۔ میں انہی پریشانیوں میں غرق تھا کہ موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ عابدہ نے جلدی سے میرا بازو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا: "اٹھیے اٹھیے وہ آ گئے۔" میں نہیں نہیں کہتا رہا لیکن عابدہ مجھے زبردستی

ایک قیدی کی طرح کھینچ کر لے گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں قدرتی مناظر کے لحاظ سے "برسات" واقعی ایک بے مثال تصویر تھی۔ لیکن اس کے تمام مناظر میری بڑھتی ہوئی پریشانیوں پر اثر انداز نہ ہو سکے، مایوس گیا اور اداس ہو کر آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر ان الفاظ نے "مجھے کسی سے پیار ہو گیا" جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔

نرگس کی معصومیت۔ ممی کی الجھی ہوئی اداکاری۔ پریم ناتھ کے جھٹکے اور راجکپور کی پریشانیاں، میرے دل کی گہرائیوں تک اتر گئیں چونکہ میں نجمہ سے وعدہ خلافی کر چکا تھا۔ شرم کے مارے ساری رات سو نہ سکا جب مجھے دفتر کا خیال آتا تو میرا بدن کانپ اٹھتا اور بے ساختہ میری زبان سے نکل جاتا "مجھے کسی سے پیار ہو گیا"۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ اگلے روز دفتر نہ جاؤں۔ لیکن پھر خیال آتا آخر میں کب تک نہ جاؤں گا۔ انہی پریشانیوں میں رات گزر گئی۔ صبح میں حسب معمول دفتر پہنچا۔ میرے میز پر ایک عرضی پڑی تھی جس میں نجمہ نے اپنا استعفےٰ لکھا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ اس کا حساب چکا دیا جائے۔

نجمہ کو میرے دفتر میں کام کرتے آج پورے دو سال ہو گئے نجمہ کو ملازم رکھتے وقت میں نے تحریری وعدہ دیا ہوا تھا۔ کہ تنخواہ کے

علاوہ سالانہ منافع کا دس فیصدی منافع اسے دیا جائے گا پچھلے سال تو کوئی نفع ہوا ہی نہ تھا۔

میں کرسی پر پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ نجمہ نے میری طرف دیکھا۔ اور فوراً حقارت سے منہ پھیر لیا۔ میں نے میز پہ پڑی ڈاک پڑھنا شروع کر دی۔ ڈاک پڑھ چکنے کے بعد میں نے سالانہ حساب کا رجسٹر منگوا کر دیکھا تو نجمہ کے نام دس ہزار روپیہ نکلا۔ میں نے سوچا کہ چلو اچھا ہوا نجمہ روپے کے لالچ میں آ کر بھول جائے گی۔ میں خوشی خوشی رجسٹر اٹھا کر نجمہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ نجمہ تعظیماً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بھرائی ہوئی آواز سے میرے اسلام علیکم کا جواب دیا۔ میں نے کہا دیکھو نجمہ تمہیں ملازم رکھتے وقت میں نے وعدہ کیا تھا کہ منافع کا ۱/۱۰ حصہ تم کو دیا جائے گا تم خوب جانتی ہو پچھلے سال تو بڑی مشکل سے اخراجات ہی پورے ہوئے تھے۔ لیکن اس سال قادر بے نیاز نے ہمارے حال پر مہربانی کی ہے۔ ایک لاکھ روپیہ نفع ہوا ہے لہٰذا میرے وعدہ کے مطابق دس ہزار روپیہ حاضر خدمت ہے۔ قبول فرمایئے۔" میں تو یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کہ نجمہ کھکھلا کر شکریہ ادا کرے گی۔ لیکن اس کے برعکس نجمہ نے نہایت سنجیدہ الفاظ میں کہا

"رشید صاحب! کاش آپ روپے کے عوض اپنی محبت کا ایک

اننے احسن مجھے دیتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ دس ہزار روپے کی بجائے آپ دس لاکھ بھی نجمہ کو دے دیں تو نجمہ، نجمہ ہی رہے گی۔ روپیہ عورت کی عزت میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ عورت کی عزت اس کی عصمت ہے اور یہ اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے جب مرد اس کا محافظ بنے اور عورت اس مرد پر اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہتی ہے۔۔۔۔۔ ایک نوجوان خاتون کی اس سے بڑی کوئی خواہش نہیں ہوتی کہ وہ مرد جسے وہ اپنی زندگی کی تکمیل کا جزو سمجھ چکی وہ اسے۔۔۔۔۔

نجمہ بے حد پریشان تھی کہنے لگی۔

"مجھے صرف اپنی تنخواہ چاہیئے۔ میں نے دس ہزار کا چیک اس کے میز پر رکھ دیا۔ چیک تو اس نے اٹھا لیا۔ مگر وہ ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ناراض نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے واقعی اس دن اس بات کا احساس ہوا کہ عورت کیا چیز ہے میں نے کہا

"نجو مجھے معاف کر دو۔ کچھ ایسی مجبوریاں سامنے آگئیں تھیں کہ میں مجبور ہو گیا۔ نجو یقین جانو ے

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

اگر آپ کی یہ حالت رہی ہے تو میری بھی کیفیت عین فقرے کے مطابق

ہی رہی۔ ع

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا۔

میں ان انسانوں کے ساتھ ہرگز ہرگز کام نہیں کرسکتی جنہیں اپنے الفاظ کا پاس نہ ہو۔

"نجو! تم پاگل ہو گئی ہو کیا۔ تم سمجھتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ شاید تم الفاظ کے معنی سے ناواقف ہو" یہ سنتے ہی نجمہ ابرو تان کر بولی۔

"اگر میں ان کے معنی سے ناواقف ہوں۔ تو آپ بھی اپنے وعدے کی تکمیل سے آگاہ نہیں۔ مجھ پر اس لئے آوازے کسے جاتے ہیں کہ میں آپ کے دفتر میں ملازم ہوں" یہ فقرے صرف اس لئے تراشے جاتے ہیں کہ میں عورت ہوں" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی برقع اٹھایا اور یہ کہتی ہوئی دروازے کی طرف چلی۔

"اف عورت کبھی بھی مرد کے مظالم کو فراموش نہیں کرسکتی۔ مرد کی نظر میں عورت ایک کھلونا ہے"

میں نے آہستہ سے کہا

"نجمہ سچ مچ تمہارے دل میں میرے لئے محبت ہے تو ایک ساعت کے لئے بیٹھ جاؤ۔ جب تم نہ رہنے پر تل ہی چکی ہو تو پھر میں کیا، دنیا کی کوئی طاقت بھی تمہیں یہاں کام کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی

خدا نے پھر کبھی اس فانی دنیا میں ایک دوسرے سے مل سکیں یا نہ اس لئے میں ایک بار پھر تمہاری منّت کرتا ہوں کہ اگر تم کسی طرح نہیں رک سکتی تو کم از کم ناراض ہو کر تو نہ جاؤ۔ مجھے صرف اس بات نے آج تک روکے رکھا کہ میں "شادی شدہ ہوں" میں مناسب نہیں سمجھتا کہ عابدہ کا اور تمہارا آپس میں جھگڑا رہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ان باتوں کا نجمہ نے نہایت متانت کے ساتھ جواب دیا کہنے لگی۔ "مجھے یہ بات سن کر شرم آتی ہے۔ آپ نے مجھے اس قدر بے وقوف کیوں سمجھ لیا۔ اگر ان باتوں کا فیصلہ مجھے ہی کرنا تھا تو میرا تو آج بھی یہی فیصلہ ہے۔ اور نہ جانے کب تک"۔ ۔ ۔ ۔ نجمہ نے کمرے سے باہر قدم رکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو"

اگلے روز جب میں دوپہر کے وقت دفتر پہنچا۔ تو دفتر کے سامنے ایک نیلے رنگ کی فورڈ کار کھڑی تھی۔ آج میرا جنم دن تھا۔ چونکہ نجمہ جا چکی تھی عابدہ قدرے بیمار تھی۔ اس لئے میں نے عابدہ کو امسال سالگرہ منانے سے منع کر دیا تھا۔ میں اندر داخل ہوا۔ تو سامنے ایک خاتون میری کرسی پہ بیٹھی نظر آئیں میں حیران تھا کہ یہ کون ہیں۔ مجھے شک گزرا کہ نجمہ ہے مگر پھر سوچا کہ نجمہ دفتر میں برقع استعمال نہیں کرتی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی

بھاری آواز میں کہا

"بابو یہ لو موٹر کی رسید۔ یہ نجمہ نے دی ہے تمہارے جنم دن کا انعام۔ اور وہ خود بمبئی اپنے ماموں کے ہاں جا رہی ہے۔"

میں نے اپنے سر کے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے کہا

"میں نہیں مانتا۔ بوڑھیا تم غلط کہتی ہو۔ میری نجمہ ایسی نہیں وہ میری زندگی ہے۔ مجھے موت بھی اس سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اسے کبھی نہیں جانے دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں دفتر سے باہر جانے لگا کہ سامنے بیٹھی خاتون نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے نقاب اٹھایا۔ دیکھا تو نجمہ تھی۔ گر ذرا آواز بدل کر مجھ سے گفتگو کر رہی تھی۔ میں مسکرا دیا۔ اور سر جھکا کر عرض کیا!

"نجمہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ میری خاطر تمہیں کار خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ برقع میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کا امتحان لے رہی تھی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ آپ مجھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں آج بہت خوش تھا۔ شام کو جب کار پر گھر واپس لوٹا تو سامنے

والا گیٹ بند تھا میں نے ہارن بجایا۔ دل میں سوچا کہ عابدہ کار دیکھ کر خوش ہو گی۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔

وہ باہر نکلی۔ بجلی کی تیزی کی طرح میری طرف آئی اور چلا کر کہا۔

"میں سوچتی تھی کہ اس چڑیل نے کام چھوڑ دیا ہے تو اب کچھ بچت ہو گی۔ مگر صاحب بہادر تو روپیہ برباد کرنے پر اُتر آئے۔"

میں نے قدرے تلخی سے بولا۔ بیگم ناراض کیوں ہوتی ہو۔ یہ کار تو نجمہ نے مجھے جنم دن کے انعام میں دی ہے۔"

یہ سن کر عابدہ آگ بگولا ہو گئی۔ اور سر ہلاتے ہوئے کہا

" اچھا تو اس کی یہ ہمت "

آج عابدہ نے کھانا نہ کھایا۔ میں نے لاکھ کہا کہ کھانا کھا لو مگر کہنے لگی۔ میری طبیعت علیل ہے۔

اسی طرح کئی روز گزر گئے۔ کبھی کبھی عابدہ کے پیٹ میں اسطرح کا شدید درد اُٹھتا۔ کہ وہ پریشان ہو جاتی ۔ کوئی چیز ہضم نہ ہوتی۔

اتوار کا دن تھا۔ میں عابدہ کے پاس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ فوراً میری نظر سرحد کمیشن کی تجاویز پر پڑی۔ لکھا تھا

"پاکستان کی سرحد کبھی امرت سر سے آگے نہ بن سکے گی۔"

میں اٹھا کار میں سوار ہوا۔ اور بنک پہنچا۔ تاکہ اپنا تمام روپیہ تبدیل کرنے کا بندوبست کروں۔ میرا حساب لائیڈز بنک میں تھا۔ مینجر نے مجھے ہر تسلی دی مگر میں نہ مانا۔ عابدہ کی بیماری بڑھتی گئی۔ دوستوں نے ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔

چنانچہ میں نے عابدہ کو الہ آباد کے ایک اچھے ہسپتال کی پرائیویٹ وارڈ میں داخل کروا دیا۔ نجمہ اس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ ساری ساری رات میری خاطر عابدہ کے لئے جاگتی۔ ایک رات میں کوئی ۲ بجے ہسپتال سے روانہ ہوا۔ تاکہ دیکھوں۔ زاہد اکیلا گھر پریشان نہ ہو جائے جب گیٹ پر پہنچا۔ تو پہرہ دینے والے پٹھان نے مجھے روکا۔ کہنے لگا۔

"مت جاؤ شہر میں خطرہ ہے۔ کئی مسلمانوں کے مکان جل رہے ہیں۔ سنا ہے پرسوں پاکستان کی سرحد کا اعلان ہوگا"

میں کئی دنوں سے پٹرول جمع کر رہا تھا۔ گھر پہنچکر پٹرول اور ضروری سامان موٹر میں رکھا۔ زاہد کو ساتھ لیا اور ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ تمام حالات کا ذکر عابدہ سے کیا۔ تمام حالات سننے کے بعد ہم نے صلاح کی کہ لاہور چلے چلیں۔

نجمہ کہنے لگی کہ وہ بھی ساتھ ہی چلے گی۔ اس کے ماموں جنہوں نے اسے پالا تھا۔ وہ تو پہلے ہی لاہور آ چکے تھے۔ مگر وہ عابدہ کی بیماری کی خاطر

ہوئی تھی چلتے ہوئے عابدہ کہنے لگی۔ کہ ایک دفعہ گھر کی شکل دیکھ چلیں۔ چنانچہ ہم کار لے کر بنگلہ کی طرف روانہ ہوئے میں نے سامنے والے گیٹ پہ کار روک دی دیکھا کہ چند لوگ ہمارے سامنے والے دروازے کو توڑ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر زاہد نے چلّا کر کہا۔

"لوگو تم کیا کرتے ہو۔ یہ ہمارا گھر ہے۔"

ایک بدمعاش نے غصہ میں آ کر کہا۔

"چپ بے لڑکے۔ گولی مار دوں گا۔"

ایک اور نے سامنے والے دروازے پر آگ لگا دی۔ یہ دیکھ کر میں نے کار سٹارٹ کی۔ زاہد نے باہر منہ نکال کر کہا۔

"ہم واپس آئیں گے۔ ہم الہ آباد فتح کریں گے۔ پاکستان زندہ باد"

یہ سن کر ایک ظالم نے پستول چلایا۔ گولی میرے ننھے کے دل پہ لگی۔ وہ خون سے لت پت کار میں آ گرا۔ ہم چند ہی منٹوں میں شہر سے باہر چلے آئے۔

عابدہ بہت کمزور تھی بچے کا یہ حادثہ دیکھ کر یہ کہتی ہوئی رستے میں ہی چل بسی۔

"میرے بچے اگر تو جوان ہو کر ادب پاکستانی فوج کا سپاہی ہو کر الہ آباد میں مرتا۔ تو کتنا اچھا ہوتا۔ تو نے تو پاکستان کے لئے قربانی دینے میں بہت جلدی کی۔"

ہم دونوں لاشوں کو لاکھوں دشمنوں کی نظر سے بچاتے لاہور پہنچے۔

کل صبح میری اور نجمہ کی شادی ہے۔ میں ساری رات زاہد کی یاد میں بے چین بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ زاہد میرے سامنے بار بار آ کر کھڑا ہو جاتا اور پکار پکار کر کہتا

"اگر آپ ہسپتال سے واپس گھر نہ جاتے۔ تو شاید آج میں پاکستان میں زندہ ہوتا اور آپ اس طرح میری قبر پہ پھول نہ چڑھاتے۔"

شالی

"دیکھتی نہیں ہو یہ انٹر کلاس ہے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہو۔ اور وہ بھی انٹر کلاس میں۔"

یہ کہہ کر ٹکٹ بابو آگے بڑھا اور سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو بازو سے پکڑ کر سیٹ پر سے اٹھانا چاہا۔

لڑکی سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور ٹکٹ بابو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بابو تم جیسے بے درد کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں۔ اور کیا ہو گئی ہوں؟"

بابو اکڑ کر بولا "تم کون ہو؟ کیا ہو گئی ہو۔ اور کیا بننے کا ارادہ رکھتی

ہو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے تمہارا اور اس ننگے سادھو کا ٹکٹ چاہیئے۔"

یہ سن لڑکی کا بھائی جس کی عمر کوئی دس سال کے لگ بھگ تھی چلا کر بولا۔

"بابو ایک وہ دن تھا۔ کہ ہم بھی امیر تھے۔ آج غریب ہو گئے تو کیا ہوا ہم مہاجر ہیں۔ اور آج ہی تو ہندوستان سے آ رہے ہیں میرا بڑا بھائی کراچی میں مجسٹریٹ ہے"

یہ سن کر شالی نے اپنے بھائی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہنے لگی "ببلو ان کو یہ بتانے سے کیا فائدہ۔ انہیں ہماری مجبوریوں سے کیا۔ انہیں کیا معلوم ہم پر کیا گزری ہے"

دیپو خاموش نہ رہا۔ بابو کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

بابو صاحب! اگر تمہیں حق ہے کہ بغیر ٹکٹ سفر کرو۔ تو ہمیں کیوں نہیں۔ ہم نے پاکستان کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ گھر گیا، زمین گئی۔ ماں باپ قتل ہوئے۔ ایک بھائی کا ہی سہارا باقی ہے وہ بھی بڑا آفیسر ہے۔ خدا جانے ہمیں پناہ دے یا نہ دے۔

یہ سن کر ڈبے کے تمام لوگوں نے بابو کو سمجھایا۔ مگر بابو بڑا ڈھیٹ تھا کہنے لگا۔ "اگر آپ لوگ مہاجر ہیں۔ تو میں کون سا لوکل ہوں میرے دس تانگے

تجھے بٹالے میں! اب میرے پاس ریلوے کے اس نیلے کوٹ کے سوا کیا ہے میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ جب دونوں بہن بھائی جیل کی ہوا کھائیں گے تو دماغ درست ہوجائے گا۔ کم از کم انہیں ریلوے کے لوگوں سے بولنے کی تمیز تو آجائے گی۔

میں ایک کونے میں بیٹھا یہ تمام ماجرہ دیکھ رہا تھا۔ بالو نے چھوٹے دیپو کے لمبے لمبے بالوں کو جن میں مٹی اٹکی ہوئی تھی کھینچتے ہوئے کہا "چل بے نواب صاحب کے بچے۔ تجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کروں۔"

گاڑی روہڑی اسٹیشن پر رکی۔ بالو نے لڑکی کو بھی دھکا دیا۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے شریفانہ لہجے میں بالو کو روکا۔ مجھے بھی بالو نے آنکھیں دکھائیں۔ کہنے لگا مسٹر اگر اتنی ہمدردی ہے تو کرایہ دے دو۔" مجھے غصہ آگیا۔ میں نے بٹوا نکالتے ہوئے کہا۔" کہو بابو کتنا کرایہ ہے

"تیس ۳۰ روپے دس آنے"

میں نے جھٹ سے پیسے نکالے اور بابو سے رسید طلب کی۔ بابو نے رسید بنائی۔ اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔" تم بھی لوکل معلوم دیتے ہو۔ جب بابو چل دیا۔ تو میں نے اس کا نام پوچھا۔ کہنے لگی۔

"بھیا میرا نام ستالی ہے۔ کل صبح ہی تو ہم نے راوی پار کیا ہے

میں نے تعجب سے پوچھا وہ کیسے" میرا سوال سُن کر مہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگی "بھیا چھوڑو کیا کرو گے سن کر ہماری داستان تم سے نہ سنی جائے گی۔ میں نے اصرار کیا۔ مہاجرہ نے اپنا دوپٹہ سنبھلتے ہوئے کہا اچھا تو سنئیے۔

"ہمارا باپ گورداسپور کے محکمہ انہار میں ایس' ڈی' او تھا۔ جب تقسیم پنجاب میں فسادات ہوئے۔ تو ہم سب کار میں سوار ہو کر بٹالہ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر سنا کہ حالات بہت خراب ہیں چنانچہ والد صاحب کہنے لگے کہ بٹالہ میں ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس لئے ہم کار لے کر بٹالہ سے ڈیرہ بابا نانک آرہے تھے خیال تھا کہ راوی پار کرنے کے بعد ہم پاکستان پہنچ جائینگے۔ بٹالے سے اس سڑک پر جو ڈیرہ بابا نانک پہنچتی ہے ایک گاؤں تلونڈی تپالہ ہے جب ہم اس کے نزدیک پہنچے۔ تو جھاڑیوں میں بہت سے سکھ نظر آئے۔ میں نے والد صاحب سے کار تیز کرنے کو کہا۔ سکھ اُٹھے اور کار کی طرف بھاگے اور چلا کر کہا۔

"کار روک دو۔ ورنہ ہم شوٹ کر دیں گے"

والد صاحب نے کار نہ روکی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہم پر گولیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔ بھیا قسمت خراب تھی۔ ایک گولی موٹر کے ٹائر میں لگی۔ مجبوراً کار روکنی پڑی۔ اب سکھ ہمارے نزدیک آچکے تھے۔ ایک نے آتے ہی

اور ابا پر وار کیا۔ ابا کے پاس پستول تھا۔ انھوں نے چار آدمی گرائے آخر ایک گولی ان کے سر میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ جب ماں باپ مر چکے اب میں اور انور باقی تھے۔ ایک سکھ سردار نے انور کو بھی جسے میں اب دیپو کہتی ہوں۔ مارنے کا حکم دیا۔ میں جھٹ سے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور کہا پہلے مجھے مارو۔ ایک سکھ چلا کر بولا "ہمیں تیری ضرورت ہے۔"

میں پڑھی لکھی تھی جب فسادات ہوئے ہیں اس وقت سکنڈ ایر میں پڑھتی تھی۔ سوچا کیا ترکیب نکالوں۔ میں آگے بڑھی۔ اور ایک سکھ کے پاؤں پکڑ کر کہا۔ اگر مجھے لے جانا چاہتے ہو۔ تو میرے بھائی کو زندہ رہنے دو۔ وہ سب مان گئے۔ انھوں نے کار سے سامان نکالا۔ پنکچر لگا کر سب کار پر سوار ہوئے اور ہمیں ڈیرہ بابا نانک کے مغرب کی طرف ایک کنوئیں پہ لے آئے میں اور انور وہاں دو سال رہے۔ کئی دفعہ بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر تمام کوششیں ناکام رہیں۔ انھوں نے انور کا نام دیپو رکھا۔ اور میرا نام بچنو۔ ہم پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے مگر ہم سب کچھ اس امید پر سہہ رہے تھے کہ ایک دن پاکستان جا سکیں گے۔

میں اکثر انور کے ساتھ راوی کے کنارے ڈھور چرانے جایا کرتی ہم جس سکھ کے پاس تھے۔ وہ ہماری بہت نگرانی کیا کرتا تھا۔

ایک دن انور کہنے لگا۔ بہن اگر میں اس بھینس کے اوپر بیٹھ جاؤں

اور تم دم پکڑ لو تو ہم ایک گھنٹے میں پاکستان پہنچ سکتے ہیں۔

میں نے بچنے کی ترکیب پر کئی بار سوچا۔ آخر ایک دن میں نے شراب کی دو بوتلیں لیں۔ راجندر سنگھ ہل چلا رہا تھا۔ میں دوپہر کی روٹی لے کر پہنچی جب پانچ بجے تو راجندر نے مجھے واپس گھر جانے کو کہا۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ آج تو آپ کے لئے شراب کی دو بوتلیں لائی ہوں یہ سنکر راجندر کھکھلا کر ہنس پڑا۔ کہا اچھا اگر یہ بات ہے۔ تو چلو دریا کے کنارے بیٹھکر شراب پئیں گے۔ تم گانا۔ میں پیوں گا۔ میں نے شراب کی بوتلیں سنبھالتے ہوئے کہا کیوں نہیں۔ آج تو شراب بھی تازہ لائی ہوں۔ سورج غروب ہو رہا تھا انور پاس بیٹھا مجھے بار بار اور پلانے کا اشارہ کرتا۔ آج راجندر نے اس قدر پی۔ کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ جب مجھے پورا الیقین ہو گیا کہ وہ اب اٹھ نہیں سکتا تو میں نے انور کو اشارہ کیا۔ انور آگے بڑھا۔ اس کی کرپان سنبھالی اور یہ کہہ کر وار کیا۔

"ہم پاکستانی ہیں۔ آج میں نے اپنے ماں باپ کے خون کا بدلہ لے لیا۔ ہم کنارے پر بیٹھے تھے۔ انور کے وار کرتے ہی راجندر کی گردن دریا کی لہروں میں یہ کہہ کر سما گئی۔ کہ پاکستانی اپنے فرض کو ابھی تک نہیں بھولے۔"

ہم نے اس کے دھڑ کو راوی کی لہروں کے سپرد کیا۔ میں نے بھینس کی

دم پکڑی۔ انور اوپر بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں ہم دریا کے اس پار چلے آئے چلتے چلتے راستے میں دو آدمی ملے۔ ایک نے کہا ان کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔ یہ ہندوستانی معلوم دیتے ہیں۔ شاید دریا پار کر کے آئے ہیں چلو انکو تھانے لے چلو۔ ہم نے انکی منت سماجت کی۔ مگر وہ ضد پر ڈٹے رہے آخر ہم نے وہ بھینس انھیں دے دی خود لاہور پہنچے اور گاڑی پر سوار ہو گئے۔

اب ہم اپنے بھائی کے پاس جو کراچی میں مجسٹریٹ ہے جا رہے ہیں سنا ہے وہ کراچی اسٹیشن پر ان لوگوں کو جو بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے ہیں قید کرتا اور جرمانے کرتا ہے یہ سوچکر کہ ہمیں کوئی کچھ نہیں کہے گا ہم گاڑی پر سوار ہو گئے۔

ابھی شالی اپنی کہانی ختم کرنے نہ پائی تھی کہ وہی بابو ڈبے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ انور نے گھبرا کر کہا۔ کہ وہ بابو پھر آ گیا۔ اتنے میں بابو صاحب آ گئے کہنے لگے مسٹر میں نے تھرڈ کلاس کا کرایہ لیا ہے۔ ان کو کہیئے تھرڈ کلاس میں سفر کریں شالی اور انور نے انکار کر دیا۔

بابو نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا ساتھ والے ڈبے میں مجسٹریٹ صاحب ہیں وہ واپس کراچی جا رہے ہیں نیچے اتر آؤ ورنہ دھکے مار کر باہر نکالنا پڑیگا شور سُن کر ساتھ والے ڈبے سے مجسٹریٹ صاحب نے منہ باہر نکالا بابو نے چلا کر کہا حضور یہ دونوں سواریاں مجھے بہت دیر سے تنگ کر رہی ہیں مجسٹریٹ نے غصے میں آ کر بابو کو کہا۔

"جلدی یہاں لے آؤ۔ گاڑی چلنے والی ہے۔"

بابو شالی اور انور کو مجسٹریٹ کے ڈبے میں لے گیا۔ میں بھی ساتھ تھا جب اندر داخل ہوئے تو مجسٹریٹ انھیں دیکھ کر زور زور سے رونے لگا۔ اس نے شالی اور انور کو کئی بار چوما۔ ہاں یہ ان کا سب سے بڑا بھائی تھا صرف ایک ہی سہارا جس کے لئے انھوں نے اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی وہ روئے جا رہا تھا اور بار بار کہتا تھا۔

"بچو تمہاری یہ حالت کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تم کہاں ہو۔ شالی نے ٹکٹ بابو کا سارا ماجرا بیان کیا۔ مجسٹریٹ نے میری رقم مجھے زبردستی واپس کر دی۔ اور شکریہ ادا کیا۔

پردیسی کا پیار

ویسے تو ممتاز غریب ماں باپ کا بیٹا تھا۔ مگر خدا کی مہربانی سے کچھ ایسا دل و دماغ پایا تھا۔ کہ سب اس کی قابلیت کی داد دیتے تھے۔ جون کا مہینہ آیا کالج کے تمام لڑکے خوش تھے کہ وہ چھٹیوں میں اپنے گھر جائیں گے۔ انسان دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گھوم جائے۔ لیکن جو آزادی اور آسائش اپنے گھر میں ہے کہیں نصیب نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے جوں جوں چھٹیوں کے دن آ رہے تھے ممتاز پہلے کی نسبت زیادہ پریشان نظر آتا تھا جونہی اس کا خیال اس چکی کی طرف جاتا جو اس کی ماں دن رات پیسا کرتی تھی؟ تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر

اُمنڈ آتا۔ ایک دن ممتاز انہی پریشانیوں میں کلاس روم سے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے منظور علی آتا ہوا نظر آیا۔ ممتاز کو دیکھتے ہی ہنس کر بولا۔

"کیوں ممتاز! آج کل اس قدر پریشان کیوں نظر آتے ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟"

ممتاز نے آسمان کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "خدا بھی کیسا خدا ہے کسی کو تو اتنا دے رکھا ہے کہ پشتوں تک اس سے ختم نہ ہو سکے۔ اور کسی کو اتنا مجبور رکھا ہے کہ وہ اپنے عالم جوانی میں بھی اپنے والدین کی مصیبتوں میں ہاتھ نہ بٹا سکے۔ منظور بھیا میرا حال کیا پوچھتے ہو؟ میری کل کائنات یہی ہے اور بس۔ گزرے سال سالک کے ابا نے کچھ کام دے دیا تھا ڈھائی مہینے بڑے مزے سے گزر گئے اب یہی سوچتا ہوں کہ خدا جانے یہ دن کیسے گزرینگے اور خدا جانے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا"۔۔۔۔۔۔

یہ سنتے ہی منظور علی کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

"چھوڑو یار۔ بڑے بزدل آدمی ہو چھٹیوں میں تو ابھی دس دن اور ہیں مگر تم ہو کہ ابھی سے پریشانیوں کو اپنے گلے کا ہار بنائے بیٹھے ہو"۔

منظور علی اور ممتاز یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں اصغر ہاتھ میں اخبار لئے ممتاز ممتاز پکارتا ان کے پاس آپہنچا۔ کہنے لگا۔ "ابے او جی

معاف، اجازت ہو تو ...... اصغر نے آگے بڑھ کر اخبار کھولا اور ممتاز کو دے دیا۔ اور ساتھ ہی کہا۔ "لو میاں تم اتنے دنوں سے حیران تھے کہ چھٹیوں میں کیا کروں گا۔ کہاں سے کھاؤں گا۔ پڑھ لو اس کمپنی کو چار میٹرک پاس ایجنٹوں کی ضرورت ہے"

نوکری کا نام سنتے ہی ممتاز کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے وہ مسکرا دیا۔ خدایا تیرا شکر ہے۔ ممتاز آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

منظور علی نے اصغر کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیوں بھئی ہمارے کالج میں کتنے بیوقوف ہیں۔ اصغر نے انگلیوں پہ گننا شروع کیا اور فوراً جواب دیا کہ پانچ۔ پھر منظور نے پوچھا۔ کہ ان میں سب سے بڑا بیوقوف کون ہے؟ اصغر ذرا سوچ کر بولا "ممتاز میاں"

یہ سن کر ممتاز غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اور بگڑ کر کہا "امیر ہر وقت غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں" ......

یہ سن کر منظور اور اصغر دونوں ہنسنے لگے اور کہا کہ پہلے نوکری کے لئے عرضی دے دو۔ پھر اللہ میاں کا شکر کر لینا۔ تم بھی عجیب آدمی ہو کہ عرضی دی نہیں۔ اور اللہ میاں کا شکر پہلے ہی ادا کرنا شروع کر دیا۔

خیر یہ قصہ یونہی ختم ہوا۔ اور ممتاز نے اگلے دن عرضی دے دی غرض اسے تین مہینے کے لئے عارضی نوکری مل گئی۔ کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے

وہ کراچی پہنچا۔ دو چار دن کام کرنے کے بعد ماں کو پچاس روپے کا منی آرڈر کیا۔ اور ساتھ ہی لکھا کہ وہ اس وقت تک گھر نہیں آئے گا جب تک کہ اگلے سال کی فیس نہ کما لے گا۔ پچاس روپے کا منی آرڈر دیکھ کر اُسکی ماں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ماں کی خاشی کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کبھی غربت جیسی لعنت سے ٹکرائے ہوں +

ممتاز حسب معمول اپنا کام کرتا رہا۔ پہلے ہی ماہ ممتاز نے اس جانفشانی سے کام کیا۔ کہ مالک نے خوش ہو کر کمیشن کے علاوہ چار سو روپے ماہوار دینے کا وعدہ کیا۔ چند دن کراچی ٹھہر کر ممتاز نے سورت کا رُخ کیا دوران سفر میں اس کی ملاقات سورت کے ایک ہوٹل کے مینجر سے ہو گئی اور بہت جلد یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ مینجر کے اصرار پر ممتاز نے سورت پہنچکر اسی کے گھر قیام کیا۔ وہ حسب معمول صبح اٹھا اور کام پر چلا گیا۔ گرمی اس شدت کی تھی کہ مجبور ہو کر واپس لوٹا دو بج چکے تھے۔ اور وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا کہ مینجر کی لڑکی جو اس کے بڑھاپے کا سہارا تھی اندر داخل ہوئی۔ اس کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ جسے دیکھ ممتاز بے قرار سا ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر صرف یہ کہہ کر رک گئی "کہ آپ چائے پئیں گے"

ممتاز نے نہایت ادب سے کہا "جی نہیں۔ شکریہ"

حمیدہ واپس چلی گئی اور چند ہی منٹوں کے بعد پھر آموجود ہوئی۔ اور

شرماتے ہوئے کہا: "معاف کیجئے گا۔ میں آپ کا نام پوچھنا بھول گئی تھی۔" ممتاز نے سر اوپر اٹھایا مگر حمیدہ کی بڑی بڑی آنکھوں کی جن سے جوانی ٹپکتی تھی، تاب نہ لا سکا، سر جھکا کر بولا۔

"اجی مجھے ممتاز کہتے ہیں"۔ "ممتاز" حمیدہ نے حیران ہو کر پوچھا

"جی ہاں ممتاز"

حمیدہ۔ "پھر تو بڑے خاص آدمی ہیں آپ"۔

ممتاز۔ "جی ہاں"

یہ کہہ کر حمیدہ پھر غائب ہو گئی"

ایک دن ممتاز بستر پر پڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ حمیدہ اندر داخل ہوئی اِسکی انگلیاں مہندی سے آلودہ تھیں وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اس کا دم پھولنے لگا۔ آخر ہمت کر کے اپنا نازک ہاتھ ممتاز کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ممتاز چونک اٹھا۔ اور اپنے ہاتھ پر مہندی لگی دیکھ کر مسکرا کر پوچھا "یہ کیا؟" حمیدہ "جی مہندی۔ میں نے سوچا کہ گرمی کے دن ہیں"۔ یہ کہہ کر حمیدہ نے ایک قہقہہ لگایا۔

ممتاز بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا "حمیدہ! میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ تمہاری آنکھوں میں میرے لئے کوئی پیغام ہے تم کچھ کہنا چاہتی ہو مگر نہ جانے کونسی چیز تمکو دل کی بات کہنے سے روکتی ہے

کہو کیا بات ہے؟"

"اجی کوئی بات نہیں"۔

ممتاز نے مسکرا کر مرزا غالب کا یہ شعر پڑھا۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

قصہ کوتاہ یہ کہ دونوں کی محبت یہاں تک پہنچی کہ اُنھوں نے چپکے سے شادی کر لی۔ کالج کھلنے کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ چھٹیوں کے دن بڑے مزے سے گزرے آخر حمیدہ کی زندگی میں ایک دن ایسا آیا جب تمام دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ چلتے وقت ممتاز نے ایک ریشمی ساڑھی خریدی۔ اور حمیدہ کے سامنے رکھ کر کہا۔ "حمیدہ" اس ساڑھی کے یہ ریشمی تار اس وقت تک ہم دونوں کی محبت کے گواہ ہوں گے جب تک ہم دونوں پھر ایک دوسرے سے نہ ملیں۔ چند ماہ اور ہیں۔ اس کے بعد میں بی اے کا امتحان پاس کر لوں گا۔ اور پھر ہم دونوں محبت کی ایک دنیا بسائیں گے جس پر دنیا رشک کرے گی"۔ وہ اس قسم کی طفل تسلیاں دیتا سینکڑوں میل کا سفر کر کے لاہور چلا آیا۔ ۔ ۔

حمیدہ نے متعدد خط لکھے لیکن ممتاز نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ وہ دن بدن پریشان رہنے لگی۔ کیونکہ ممتاز کی یاد کے سوا اسے کوئی سہارا نظر نہ

آتا تھا۔ حمیدہ کے باپ نے بیٹی کی پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ مگر اس نے لاکھ کوشش کی کہ حمیدہ کی پریشانی کی وجہ معلوم کرے۔ لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ ابا جان میری طبیعت علیل ہے۔ دن گزرتے گئے۔ آخر کار باپ کو ایک دن معلوم ہو گیا کہ حمیدہ ممتاز سے شادی کر چکی ہے محلہ والوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کوئی کہتا کہ اس لڑکی کا چال چلن خراب تھا دوسرا بات کاٹ کر ارے یار رہنے دو اس کی ماں کونسی نیک تھی۔ جب یہ باتیں سن سن کر حمیدہ کا باپ تنگ آگیا۔ تو رات کو وہ اپنے بستر سے اٹھا۔ غصے کے مارے اس کی آنکھیں اس قدر لال ہو چکی تھیں۔ گویا سارے جسم کا خون آنکھوں ہی میں جمع ہو گیا ہے۔ اس نے آہستہ سے اپنا صندوق کھولا اور پستول نکال کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اسے پستول تو پہلے بھی دو عورتوں کا خون کر چکا ہے"۔ اس کے بعد پستول میں گولیاں بھرنی شروع کر دیں۔ . . .

حمیدہ کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ وہ باپ کی ان تمام باتوں کو سن رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے بعد اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے گا۔ حمیدہ نے فوراً اپنا سوٹ کیس کھولا اپنا زیور اور ممتاز کی تصویر اپنے بٹوے میں ڈال کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی مینجر صاحب بیٹی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ تو بستر خالی پایا ادھر

اُدھر ڈھونڈنا شروع کیا۔ آخر جب وہ نہ ملی۔ تو قہقہہ لگا کر کہا "اچھا ہوا کہ تو خود ہی چلی گئی۔ ورنہ تیرا خون بھی میری ہی گردن پر ہوتا۔"

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب کہ بھارت اپنی آزادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ہاں وہ ہی دن جنہیں ہم فسادات کے نام سے پکارتے ہیں۔ چاروں طرف مکان جل رہے تھے شہر میں کرفیو آرڈر کا بھوت چکر لگا رہا تھا

جب وہ گھر سے نکلی تو راستے میں دو دفعہ اسے سپاہیوں نے روکا۔ مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ وہ نرس ہے اور ڈیوٹی پر جا رہی ہے۔

مہاجر پاکستان کا رخ کئے آ رہے تھے چنانچہ اس نے بھی ممتاز کی تلاش میں پاکستان کا سفر اختیار کیا۔ دل ہی دل میں کہتی تھی "میں لاہور جاؤں گی اور ممتاز کو کہوں گی۔ کہ وہ پہ ویسی ہی نکلا ناں۔"

دل ہی دل میں اُمنگوں کا طوفان دبائے سٹیشن پر پہنچی۔ اچانک میں اور میرا بڑا بھائی اسی گاڑی سے لاہور آ رہے تھے جونہی وہ ہمارے ڈبے کے سامنے آئی۔ اور پائدان پر پاؤں رکھا۔ تو بھائی صاحب نے آگے بڑھ کر کہا "معاف کیجئے۔ ساتھ والا زنانہ ڈبہ خالی ہے۔"

یہ سن کر حمیدہ کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح قطاریں بنا کر بہہ نکلے اور اس مرجھائے ہوئے چہرے پر سے یہ کہتے ہوئے بہہ نکلے "اے انسان تجھ میں وفا نہیں۔ تو پیار تو کرتا ہے مگر اس کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھتا۔ وہ

ڈبے میں داخل ہوئی۔ اور ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ اس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے سر پر مصیبتوں کا ایک پہاڑ ہے کوئی بارہ بجے ہونگے گاڑی بڑی تیزی سے لاہور کا رخ کئے آرہی تھی کہ وہ اچانک بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ڈبے میں بیٹھی ہوئی چند عورتوں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ آخر بیس منٹ کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے "تو بڑا بے وفا نکلا" یہ کہہ کر وہ پھر بے ہوش ہوگئی۔ گویا غشی کا یہ سلسلہ گھنٹوں جاری رہا خدا خدا کر کے ہم لاہور پہنچے۔ ہم حمیدہ کو ہسپتال لے گئے۔ لیڈی ڈاکٹر سے پوچھا کہ کیا مرض ہے؟

بولیں "بچہ ہونے والا ہے۔ مگر اپریشن ہوگا۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو ہم اپریشن کر سکتے ہیں"۔

مگر میں حمیدہ کا کون تھا جو لیڈی ڈاکٹر کو اجازت دے دیتا۔ میں نے ذرا جھجک کر پھر ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ اور کہا۔

"ڈاکٹر صاحبہ کیا کیس اپریشن کے بغیر نہیں ہو سکتا؟" ڈاکٹر ذرا بدمزاج سی تھی۔ غصے سے لال پیلی ہوگئی اور چلا کر کہا۔ "ایک دفعہ جو کہہ دیا کہ نہیں ہو سکے گا۔"

اس کے بعد میں حمیدہ کے پاس پہنچا اور کہا۔ "بہن جب تک اس فارم پر تمہارے کسی رشتہ دار کے دستخط نہ ہوں اپریشن نہیں ہو سکتا"

یہ سن کر حمیدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔۔۔اس نے میری طرف دیکھا اور سر جھکا کر کہا "بھائی صاحب آپ ہی دستخط کر دیجئے"

چنانچہ اپریشن ہوا۔ بچے کی جان تو بچ گئی مگر حمیدہ کی حالت خراب ہوتی گئی۔ دوسرے دن صبح جب ہم اسے ہسپتال دیکھنے کے لئے گئے تو وہ زار زار رو رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"حمیدہ رونے سے کیا فائدہ، ہمت کرو خدا نے چاہا تو تم جلد تندرست ہو جاؤ گی"۔

"نہیں نہیں بھیا میں اب نہ بچ سکوں گی"! اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو میری طرف بڑھا کر مجھے ایک تصویر اور نیلے رنگ کا کاغذ دیا۔ تصویر میں حمیدہ کے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان کھڑا تھا اور اس تصویر کے نیچے یہ جملہ لکھا ہوا تھا۔

"پردیسی پریت کو کیا جانے"

کاغذ پر ممتاز کا سر نامہ تھا۔ یہ دو نو چیزیں میرے ہاتھ میں دے کر حمیدہ نے مجھے اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ اور مجھے تاکید کی کہ میں ممتاز کو ڈھونڈھ کر اس بچے کو اس کے حوالے کر دوں۔ یہ کہہ کر اس نے جان دیدی کفن دفن سے فارغ ہو کر میں اور میرا ایک دوست ممتاز کی تلاش میں نکلے۔ آخر وہ مل گیا۔ اس کا بچہ اس کے حوالے کرنے کے بعد ہم اپنے فرض سے

سبکدوش ہوئے۔

سنا ہے کہ ممتاز میاں اس بچے کو بہت پیار کرتے ہیں اور اس کا نام انھوں نے پردیسی رکھا ہوا ہے۔ جب کبھی بھی ملتے ہیں تو میں بچے کی خیریت کے متعلق پوچھتا ہوں۔ تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں

"بھیا یہ مت پوچھو میرا ننھا کیسا ہے یہ پوچھو میں کتنا بڑا گنہگار اور بدنصیب ہوں۔" کاش تم مجھے ایک دفعہ میری حمیدہ سے ملا دیتے

ادھوری شادی

شملہ کی پر فضا وادیوں کی یاد ابھی تک لوزہ کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے وہاں کا موسم اسے ابھی تک نہیں بھولا۔ محبت کے گائے ہوئے وہ ادھورے گیت جب اسے یاد آتے ہیں۔ تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے کبھی کبھی تو پریشانی کا یہ عالم طاری ہو جاتا ہے۔ کہ اسے اپنی خبر تک نہیں رہتی مگر بیچاری مجبور ہے۔ ہاں جا بھی کیونکر سکتی ہے

وہ اپنی پیار کی دنیا میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اس کی نظر میں زندگی ایک اچھی خاصی کشمکش ہے۔ کئی دفعہ خود کہہ چکی ہے۔ شاید میں شادی نہ کرتی۔ مگر اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ہر ملاقاتی سے وہ شملہ کا ذکر کرتی ہے

خدا جانے اسے یہ علاقہ کیوں اتنا پسند ہے دن میں کئی کئی بار کہتی ہے "ہائے وہ پر فضا وادیاں۔ اور وہ دلفریب نظارے۔"

ایک دن وہ اکیلی سیر کو نکلی۔ برسات کا موسم تھا۔ بادل زمین کے کچھ اس قدر قریب نظر آرہے تھے کہ وہ بار بار دل میں یہی خواہش کرتی کہ ان پر سوار ہو کر آسمان کی بلندیوں میں کھو جائے۔ وہ آگے بڑھی کیونکہ اسے بلندیوں پر چڑھنا تھا۔ وہ اپنی سہیلی کے پاس جا رہی تھی اس کی سہیلی کی کوٹھی ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھی۔ ابھی وہ آدھا راستہ بھی نہ جانے پائی تھی کہ آگے سامنے سے ایک بھورا ریچھ آتا دکھائی دیا — وہ پریشان ہو گئی۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر ایک شکاری جو آگ جلا کر نزدیک ہی کچھ گوشت بھون رہا تھا۔ دوڑا ہوا آیا۔

لورہ دوڑ کر اس سے چمٹ گئی۔ اس نے فائر کیا۔ ریچھ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ مگر وہ شکاری سے چمٹی رہی جب تک اسے یہ یقین نہ ہو گیا کہ ریچھ مر چکا ہے۔ شکاری نے لورہ کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

شکاری۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

لورہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ مسکرا کر کہا۔ شکریہ میرا نام لورہ ہے۔ ساڑھی کا آنچل سنبھالتے ہوئے وہ ذرا ایک قدم پیچھے ہٹی اور پھر ذرا شرما کر کہا اُدّ !

آپ کا۔

"جی مجھے آپ تسکاری ہی کہہ لیجئے۔

دونوں نے قہقہہ لگایا

لورہ نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ کوئی چیز جل رہی ہے۔ بدبو آرہی ہے

تسکاری دوڑا ہوا گیا۔ پھر چلّا کر کہا۔ میں گوشت بھون رہا تھا وہ جل گیا

لورہ۔ بالکل جل گیا ہے کیا۔

تسکاری۔ نہیں اتنا نہیں۔ آئیے کھائیے۔ دونو دیر تک بیٹھے رہے۔

تسکاری۔ پھر ملاقات کب ہوگی۔

لورہ۔ کل شام چھ بجے اسی جگہ۔

ملاقاتوں کا یہ سلسلہ لگاتار جاری رہا۔ شادی کے عہد و پیمان ہو گئے

لورہ کا ڈیڈی پاکستان میں پولیس آفیسر تھا۔ تقسیم سے پہلے لورہ شملہ

میں ایک دفتر میں ملازم تھی۔ تقسیم کے بعد لورہ کے ڈیڈی نے اسے لاہور

آنے کو لکھا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ کیسے آتی۔ ایک طرف محبت دوسری طرف

فرض۔ آخر لورہ نے یہ سوچکر کہ تسکاری دیسی آدمی ہے اور وہ اونچے

خاندان کی اینگلو انڈین، شملہ چھوڑ دیا۔ مگر خدا جانے کیوں وہ اسے کبھی بھی

نہ بھلا سکی تسکاری کا تصور کرنا تو گویا اس کی عادت سی ہو گئی تھی

پاکستان پہنچکر وہ تسکاری کو لگاتار خط لکھتی رہی وہ بھی جواب

دبتا رہا۔

ایک دو دفعہ انھوں نے سرحد پہ ملاقات کی۔ لورہ نے والٹر کو دو دفعہ لاہور آنے کی دعوت دی چنانچہ وہ لگاتار پرمٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر بھارت گورنمنٹ کا جواب نفی ہی میں ہوتا ہو موسم پہ موسم بدلا۔ آخر لورہ کے ڈیڈی نے آسٹریلیا جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

لورہ چونکہ شادی کا وعدہ کر چکی تھی۔ کہ وہ شادی والٹر ہی سے کرے گی۔ اس لیے وہ نہ جانا چاہتی تھی۔ لورہ کا بڈھا ڈیڈی چونکہ اپنے آپ کو ایک بڑا آدمی سمجھتا تھا۔ اس نے لڑکی کو کئی دفعہ سمجھایا کہ دیکھو بیٹی ولایت چل کر شادی کرنا۔ مگر محبت کو ولایت کے جھگڑوں سے کیا واسطہ۔ غرض لورہ اپنی ضد پہ قائم رہی۔

دونو باپ بیٹی میں ایک دوسرے کے لیے نفرت بڑھتی جا رہی تھی ایک دن صبح جب لورہ کا ڈیڈی اٹھا۔ تو لورہ سفید ساڑھی میں ملبوس تھی۔ یہ دیکھ کر بڈھا صاحب بڑا برہم ہوا۔ بولا۔

لڑکی تو نے یہ ساڑھی باندھنی کب سے سیکھ لی ہے۔ مجھے پسند نہیں کہ تو ہندوستانی لباس پہنا کرے ورنہ اگر تو یہی حرکتیں کرتی رہی۔ تو آسٹریلیا میں لوگ ہمیں منہ نہ لگائیں گے۔ ہم انگریز ہیں۔ انگریز! میرا دادا بڑا افسر تھا۔

خوش بھی کیوں نہ ہوتی۔ آج اس کی شادی تھی۔ مگر باپ کو خبر تک نہ ہوتی وہ حیران تھا۔ کہ لڑکی صبح سے کیوں غائب ہے صاحب بہادر پریشانی سے اپنے گول کمرے میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ جب انکی نوکرانی اندر داخل ہوئی۔ صاحب نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"اے ہندوستانی لڑکی ہمارا بڑا والا بابا کدھر جانا (یعنی ہماری بڑی لڑکی کہاں گئی)

نوکرانی۔ حضور۔ واہگہ۔

صاحب۔ واہگہ کس لئے۔

نوکرانی۔ صاحب میا بابا شادی کرنے گیا ہے۔

صاحب۔ چپ رہو۔ واہگہ میں کوئی گرجا نہیں جہاں شادی ہو سکے

نوکرانی۔ صاحب انھوں نے مجھے ایسا ہی بتایا ہے ایک بوڑھا پادری بھی ساتھ گیا ہے۔

صاحب۔ آنے دو آج میں اسے گولی ماردوں گا۔

اتنے میں ڈاکیہ اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں تار تھا

تار کھولتے ہی بڈھے صاحب کے ہاتھ کانپنے لگے۔ تار کراچی سے آیا تھا کہ جہاز پرسوں صبح سات بجے کراچی سے روانہ ہوگا۔ صاحب نے لورہ کی ماں کو پکارا۔ وہ دوڑی ہوئی آئی کہنے لگا۔ آج لورہ کی شادی ہے۔

یہ نہیں ہو سکتا۔ .... تم بات سمجھنے میں ہر وقت دیر کرتی ہو میم۔ مگر میں کہتی ہوں تم پاگل ہو۔ اگر اُسے شادی کرنی تھی تو ہمیں کہتی۔

صاحب بہادر کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔ اتنے میں گھڑی نے چھ بجائے۔ کسی نے زور سے دروازہ کھولا۔ صاحب آگے بڑھا تاکہ دیکھے کہ کون ہے۔ سامنے لورہ کھڑی کانپ رہی تھی۔ باپ نے اس کا گلا گھونٹنا چاہا مگر ...... ماں نے چھڑا دیا۔ جب لورہ سے آسٹریلیا جانے کے متعلق پوچھا گیا۔ تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی میں نہیں جا سکتی۔ جب میرا خاوند پاکستان چلا آئے گا تو ہم یہیں سکونت اختیار کریں گے۔ آسٹریلیا میں صرف سفید رنگ کے لوگ ہی تو ہوں گے باقی اور وہاں کیا رکھا ہے۔ پاکستان میں آرام کی ہر چیز موجود ہے۔ گندم ہے۔ کپڑا ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر میرا خاوند جو دو ماہ کے اندر اندر یہاں آرہا ہے۔ میں نے شادی اس ہی لئے کی تھی۔ کہ یہاں رہوں۔ ماں باپ ناراض ہو گئے اور اسی شام کراچی روانہ ہو پڑے تاکہ جہاز پر سوار ہو کر آسٹریلیا چلے جائیں۔

لورہ اور والٹر ہر اتوار کو سرحد پر ملتے گھنٹوں پیار کی باتیں ہوتیں شام کو والٹر واپس شملہ کا رُخ کرتا اور لورہ لاہور چلی آتی

آج سوموار کا دن تھا۔ لورہ کو صبح صبح چٹھی ملی۔ لکھا تھا

ڈیر لورہ

"مجھے پاکستان آنے کا مستقل پرمٹ مل چکا ہے میں جمعرات کو ۲ بجے واہگہ پار کر دوں گا امید ہے سرحد پر ملاقات ہو گی۔ میری چھوٹی بہن جس کے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی نہیں بھی میرے ساتھ ہے۔

تمہارا والٹر

چٹھی ملتے ہی لورہ کے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسے اپنی ویران دنیا میں بہار کی امید کی جھلک دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی جو بیان نہیں کی جا سکتی۔

والٹر آج بڑا خوش تھا۔ کیونکہ وہ اپنی بیوی سے ملنے لاہور آ رہا تھا۔ جب دونو بہن بھائی امرتسر پہنچے۔ تو اسٹیشن سے تانگہ لیا تاکہ بس کے اڈے پر پہنچ کر لاہور کا سفر اختیار کیا جا سکے۔ بدقسمتی سے اس تانگے کی ٹکر ایک بس سے ہو گئی۔ والٹر کا سر پھٹ گیا کھوپری کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

لورہ اب پاکستان میں اکیلی ہے۔ جس دن سے اسے والٹر کی موت کی خبر ملی ہے وہ کبھی شملہ کا ذکر نہیں کرتی۔ لوگوں نے شملہ پہاڑی پر اسے

کئی دفعہ اکیلی آتے دیکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں لورہ پاگل ہے۔ مجھے یہ دیوانی ہے۔

جب بھی اس کے ڈیڈی اسے لکھتے ہیں کہ آسٹریلیا چلی آؤ۔ تو وہ غصے سے اپنے بال پکڑ لیتی ہے۔ انہیں کھینچتی ہے اور کہتی ہے

ڈیڈی ایسے مت لکھو۔ میرا والٹر پاکستان آئے گا اور ضرور آئے گا

ابھی چند ہفتوں کا ہی واقعہ تو ہے کہ لورہ صبح سویرے اٹھی۔ غسل کیا۔ اپنا شادی کا جوڑا پہنا۔ اور بستر پر لیٹ گئی۔ سنا ہے کوئی بارہ بجے کے قریب بستر پر مردہ پائی گئی۔ اس کی چھاتی پر ایک لفافہ رکھا تھا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

"میں نے زہر پی لی ہے میں اپنے شکاری کے پاس جا رہی ہوں۔ میں اپنی ادھوری شادی کو حقیقت میں تبدیل کر رہی ہوں۔ اب مجھے کوئی بھی آسٹریلیا جانے کو نہ کہے گا"

بعد میں معلوم ہوا کہ دوسرے ہی دن اس کے ڈیڈی اسے لینے آ رہے تھے۔ مگر وہ پاکستان چھوڑنا پسند نہ کرتی تھی۔

جیل روڈ کے موڑ پر

بدھ کا دن تھا۔ کلیم ریس دیکھ کر واپس لوٹ رہا تھا۔ آج اُسے وہاں پہ کچھ دیر لگ گئی تھی۔ کیونکہ چند پرانے دوست مل گئے۔ کلیم بی اے پاس کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ کیا کرے۔ چھوٹی سی موریس کار میں بیٹھا۔ لاہور کے ایک بڑے گھرانے کا یہ لال کس قدر بھلا معلوم دیتا تھا۔

خدا جانے وہ ان دنوں کیوں اداس رہتا تھا۔ کار بڑی تیزی سے گھر کا رخ کئے آ رہی تھی۔ کلیم کے ایک ہاتھ میں موٹر کا سٹیرنگ تھا اور دوسرے میں سگریٹ۔ وہ جینا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں

اس سے اچھا سلوک نہ کرتی تھی۔ بات بات پر جواں بچے کو ٹوکنا تو اُس کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ اپنے لاڈلے کو پیار نہیں کرتی تھی پیار تو کرتی تھی۔ مگر بڑی اماں قدرے غصّہ والی تھیں بات بات پر بگڑ جاتیں۔ حقیقت کو چھپانا مناسب نہیں بس آپ سمجھ لیجئے کہ وہ کلیم کے لئے ایک سوتیلی ماں کی طرح تھیں۔

اچانک جب کلیم جیل روڈ کے موڑ پہ شمال کی طرف مڑا تو اسے کسی لڑکی کی چیخ کی آواز آئی۔ اس نے فوراً بریک لگائی۔ اور اپنا پستول لیا۔ اور کار سے باہر نکلا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں کلیم کو شک گزرا کہ یہ چیخ کسی بے بس عورت کی ہے ٹارچ سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تو سامنے تین نوجوان کھڑے تھے۔ ایک نے لڑکی کے منہ پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ دوسرا کہہ رہا تھا۔

"یہ انگوٹھیاں اتار کر ہمارے حوالے کر دو۔" یہ سن کر کلیم نے پستول سنبھالتے ہوئے نوجوانوں کو للکارا۔

کلیم۔ خبردار! بدمعاشو... اس لڑکی کو کیوں تنگ کر رہے ہو۔

ایک لڑکا۔ بابو تیری بہن ہے یہ۔ چل رستہ ناپ

کلیم۔ اسے چھوڑ دو ورنہ گولی مار دوں گا۔

ایک لڑکا:۔ ظالم تھوٹ کر ڈھیلو بھیا بھاگ چلیں۔ لگا

پستول دیکھ کر تمام بھاگ نکلے۔ کلیم آگے بڑھا۔ لڑکی بے ہوش ہو کر زمین پہ گر پڑی۔ کلیم نے اسے اٹھا کر موٹر کی سیٹ پر لٹا دیا۔ لڑکی کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ کلیم نے اپنا رومال پھاڑ کر ماتھے پر پٹی باندھی اتنے میں لڑکی کو ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ جب کلیم کو دیکھا۔ تو اس نے پھر ایک چیخ ماری۔ سیٹ پہ پڑا ہوا پستول دیکھ کر لڑکی کی پیشانی پہ پسینہ آنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر پیاس اور ڈر کے مارے کچھ نہ بول سکی۔

کلیم۔ آپ کا نام

جی میرا نام مسرت ہے۔ لڑکی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا

کلیم۔ آرام سے بیٹھئے۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ تین لڑکے کون تھے۔

مسرت۔ جی مجھے یہ تو معلوم نہیں میں تو کل جالندھر سے لاہور پہنچی ہوں۔ تمام رشتہ دار راستے ہی میں قتل ہو گئے۔ میں اکیلی بچ نکلی لاہور گاؤں روڈ پہ ہمارا ایک رشتہ دار رہتا ہے۔ میں اس کی کوٹھی تلاش کر رہی تھی کہ راستے میں تین آدمی ملے۔ میں نے ان سے اپنے رشتے دار کا سرنامہ پوچھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھی۔ مگر ایک نے دوڑ کر مجھے پکڑ لیا اور چاقو دکھاتے ہوئے بولا۔

"دے دو جو کچھ تمہارے پاس ہے۔" دوسرے نے میرے منہ میں

کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد آپ آ گئے۔

کلیم نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا تو آپ مہاجرہ ہیں۔

مسرت۔ جی ہاں

کلیم۔ آپ کی تعلیم

لڑکی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر

جی۔ بی اے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا

چھ سال لندن میں رہی ہوں مگر۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ اب تو بے گھر ہوں۔

کلیم۔ آپ چاہتی ہیں۔ تو میں آپ کی مدد کروں۔

مسرت۔ بابو اگر کسی مسافر کو جو اپنی منزل سے بھٹک چکا ہو راستہ

دکھانے والا مل جائے تو اسے اور کیا چاہیئے

کلیم۔ چلیئے میں آپ کو آپ کے رشتے دار کے گھر چھوڑ آؤں۔

کار چلی اور گاف روڈ کے بنگلہ نمبر ۱۶ پر جا کر رک گئی۔

اس مختصر سفر کے دوران میں دونو اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے رہے

کلیم دل میں بار بار سوچتا۔ بی اے اور وہ بھی ولایت کی اور یہ حالت

جب کلیم نے کوٹھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو نوکر نکلا اور پوچھنے پر معلوم

ہوا کہ مسرت کے رشتہ دار کراچی جا چکے ہیں۔